بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

رویتِ ہلال اور ہمارے ''علمائے کرام''

جن مہینوں کے پہلی تاریخ کے چاند کو ہمارے معاشرے میں خاص اہمیت حاصل ہے ان میں شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو جس کی رویتِ ہلال میں ہر سال اختلاف نہ ہوتا ہو۔ اس اختلاف کو دور کرنے کی اپیل کیجئے تو فوراً ایک ''حدیث'' پڑھ کر سنا دی جاتی ہے کہ ''اختلاف امتی رحمۃ'' (میری امت کا اختلاف رحمت ہے) صحاح' سنن' مسانید' موطات' مصنفات' معاجم غرض دنیا کی کسی کتابِ حدیث میں یہ حدیث موجود نہیں لیکن اسے خوب اچھالا گیا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اختلافات باقی رہیں اور پارٹی لیڈرشپ پر زد نہ آئے۔ اگر گروہی جھگڑے بالکل ختم ہو جائیں تو بہت سے لوگوں کی سیادت و قیادت بلکہ ان کا وہ مصرف ہی ختم ہو جاتا ہے جس سے ان کا مفادِ عاجل وابستہ ہے یہ جھوٹی اور جعلی روایت (اختلاف امتی رحمۃ) کچھ اس انداز سے پیش کی جاتی ہے کہ گویا اتحادِ امت رحمت نہیں ہے۔ صرف اختلافِ امت ہی سراپا رحمت ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ رمضان اور عیدالفطر میں بھی یہ حضرات رویتِ ہلال کی صحیح تاریخ نہیں معین کر پاتے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہر روز کی اس بیکار کی الجھن کو بالکل ختم کر دیا جائے اور اس کی صرف ایک شکل ہے اور وہ یہ ہے کہ فلکی حساب پر اعتماد کر کے اعلان کر دیا جائے کہ فلاں دن سے فلاں مہینہ شروع ہوگا ہمارے علمائے کرام کو فلکیات کے علم پر غالباً کوئی اعتماد نہیں کیونکہ حدیث شریف میں صرف اتنا آیا ہے کہ صوموا لرویۃ وافطروا لرویۃ۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو۔

ایک امی اور سادہ ترین تمدن رکھنے والی امت کو اس سے زیادہ اور کیا بتایا جا سکتا تھا؟ جو امت لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتی ہو اس کے لئے بجز ''رُویت'' کے اور کیا طریقہ تجویز فرما سکتے تھے۔ وہاں فلکی تقویم کے وہ اکتشافات موجود نہ تھے۔ نیز اس وقت رویت کا بدل صرف ایسی عینی شہادتیں ہو سکتی تھیں جو قرب و جوار سے حاصل ہو جائیں اور اس قرب و جوار کی

مسافت اتنی مختصر و محدود ہو کہ ایک انسان ۔۔۔ پیدل یا سوار ۔۔۔ آسانی سے چند گھنٹوں میں خبر لے کر آ جائے ۔ اب حالات بدل چکے ہیں ۔ رسل و رسائل کا یہ حال ہے کہ ہزاروں میل سے چوتھائی سیکنڈ میں خبریں آ جاتی ہیں ۔ مسافت اتنی سکڑ گئی ہے کہ مہینوں کا راستہ گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے ۔ فلکی علوم اور تقویمات کا یہ عالم ہے کہ اب وثوق کے ساتھ معلوم ہے کہ:

(۱) ۲۹ دن، ۱۲ گھنٹے، ۴۴ منٹ اور ۱۷ اعشاریہ ۸ سیکنڈ میں چاند اپنی گردش پوری کر لیتا ہے ۔

(۲) ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ اور ۹ ۔ اعشاریہ ۵ سیکنڈ میں زمین اپنی مداری گردش پوری کر لیتی ہے ۔

اور آج پورے وثوق کے ساتھ مہینوں پہلے یہ پیشگوئی کر دی جاتی ہے کہ

(۳) اتنے بج کر اتنے منٹ اور اتنے سیکنڈ پر فلاں جگہ چاند گرہن یا سورج گرہن لگنا شروع ہوگا ۔ اور چاند یا سورج کے اتنے حصے پر گہن لگے گا اور پھر کم ہونا شروع ہوگا ۔ اور اتنی دیر تک فلاں جگہ اور اتنی مدت تک فلاں جگہ گہن قائم رہے گا ۔

اس موقع پر ہماری طرف سے کچھ سننے کے بجائے صبحی محمصانی کی زبان سے سنئے وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ المعلول یدور مع علته وجودا و عدما (معلول اپنی علت کے ساتھ موجود و معدوم ہوتا ہے) لکھتے ہیں کہ:

(عربی سے ترجمہ) ''اور اسی قاعدے کی بنیاد پر بعض فقہاء نے فلکی حساب سے اسلامی مہینوں خصوصاً رمضان کے ہلال کی تعیین کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ حدیث جس میں روزے کے متعلق صرف رویت ہلال پر اعتماد کرنے کا حکم ہے ایک منصوص علت کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ (مخاطب) امت امی واقع ہوئی تھی جو لکھنا اور حساب کتاب کرنا نہیں جانتی تھی ۔ لہٰذا جب یہ امت اُمِیَّت سے نکل کر لکھنے پڑھنے اور حساب و کتاب کے لائق ہوگئی اور لوگوں کے لئے ہلال کے حساب میں یقین اور قطعیت تک پہنچنے کا امکان و سامان پیدا ہو گیا تو اس عمومی صورت حال کے ہوتے ہوئے اور اُمِیَّت کی علت ختم ہونے کے بعد اب یہی ضروری ہے کہ لوگ اس (حسابی) قطعیت و یقین کی طرف رجوع کریں ۔ اور ہلال کو معلوم کرنے کے لئے تنہا (فلکی) حساب و کتاب کا طریقہ اختیار کریں اور رویت کے (سابق طریقے) کی طرف وہیں رجوع کریں جہاں فلکیات کا جاننا دشوار ہو ۔''

محمصانی نے یہ پوری عبارت اپنی مشہورِ عالَم کتاب ''فلسفۃ التشریع'' میں احمد شاکر کی کتاب ''اوائل الشہور العربیہ'' سے نقل

کی ہے جو اسی مضمون پر لکھی گئی ہے کہ اب ہلال کے معاملہ میں فلکی حساب پر بلا تامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس عبارت سے جو نکات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(۱) معلول ہمیشہ اپنی علت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(۲) ہلال دیکھ کر صوم و افطار کا حکم اس امت کے لئے ہے جو اُمی ہو۔ اور فلکیات سے واقف نہ ہو۔ نہ خبریں پہنچائی جا سکتی ہوں، نہ اخبار وغیرہ پہنچتے ہوں۔

(۳) لیکن جہاں یہ مجبوریاں نہ ہوں وہاں بلا تامل فلکی علم کے مطابق تعیین ہلال کی جا سکتی ہے اور اسی کے مطابق اسلامی تقریبات ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ آج پوری امت کس طرح اپنے بعض خالص دینی معاملات میں حساب و کتاب ہی پر اعتماد کر رہی ہے اور یہ اعتماد بالکل قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً

(۱) آج کوئی بھی سحری کے وقت اٹھ کر سیاہ اور سفید دھاری کے امتیاز کو نہیں دیکھتا۔ فلکی حساب ہی کے مطابق سائرن بجتا ہے یا گولا چھوٹتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔

(۲) بلکہ افطار کے وقت بھی غروب آفتاب کی رویت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور فلکی ریاضیات ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

(۳) اب ایک نمازی بھی سایہ ناپ کر یا اپنی آنکھوں سے شفق وغیرہ کو دیکھ کر نمازیں نہیں پڑھتا بلکہ فلکی حساب کے مطابق جو اوقات نامے مسجدوں میں آویزاں ہوتے ہیں ان ہی پر اعتماد کر کے ساری نمازیں ادا کر لی جاتی ہیں۔

غرض کئی جگہ دینی معاملے میں فلکیات پر اعتماد کیا جاتا ہے تو ہلالِ رمضان و عید میں بھی فلکیات پر اعتماد کر لیا جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟ قرآن کی رُو سے تو قمری اور شمسی دونوں طریقوں سے کیلنڈر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملت کے اجتماعی مصالح کا تقاضا یہ ہو کہ شمسی مہینوں کے مطابق حساب رکھنا زیادہ منفعت بخش ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، اگر کبھی اسلامی نظام قائم ہوا اور اس نے ایسا فیصلہ کر لیا تو پھر رویتِ ہلال کی اہمیت ہی نہیں رہے گی۔ نوع انسانی سمٹ کر ایک برادری بنتی جا رہی ہے۔ جب یہ برادری ایک خدا کے ایک قانون (قرآن) کے تابع آ جائے گی تو پھر حساب کتاب بھی اسی طرح رکھا جائے گا جس سے ان کی وحدت مستحکم ہوتی چلی جائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

روزوں کا مقصود و منتہیٰ

(پرویزؒ صاحب کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۂ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (۱۸۳۔۲/۱۸۷) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

انزل اللہ علیک الکتٰب والحکمۃ۔ (۴/۱۱۳)۔

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد' ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیّب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے

طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہوگئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کتب علیکم الصیام (۲/۱۸۳)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لعلکم تتقون (۲/۱۸۳)۔ لعلکم تشکرون (۲/۱۸۵) اور ولتکبرو اللہ علی ماھدٰکم۔ (۲/۱۸۵)۔

تتقون سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تشکرون' سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ' فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تکون لکما الکبریاء فی الارض (۷۸/۱۰) ''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں' یارائے سرکشی نہیں: ولہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض و ھو العزیز الحکیم (۴۵/۳۷)۔ ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے: وھوا الذی فی السماء الہ و فی الارض الٰہ (۴۳/۸۴)۔ ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔'' (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب

نبی اکرمﷺ کومنصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کوحکم دیا گیا کہ **یاایھا المدثر۔** ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (**المدثر** کے یہی معنی ہیں)۔**قم فانذر** ۔''اٹھ اور نوعِ انسان کوان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کردے''۔**وربک فکبر ‹۲۔۱/۷۴›۔** ''اوران نظاموں کی جگہ اس نظام کوقائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دوٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ولم یکن له شریک فی الملک۔ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا''۔اوراس سے آگے ہے:وکبره تکبیراً۔ (۱۷/۱۱۱) ''لہٰذاتم اس کی کبریائی قائم کرو''۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: المتکبر (۵۹/۲۳) کہا ہے۔کہیں الکبیر المتعال (۱۳/۹) اورکہیں:العلی الکبیر (۲۲/۶۲)۔ ہماری دنیامیں وہ العلی الکبیر کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فالحکم لله العلی الکبیر (۴۰/۱۲)' تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہرقسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔تو ہمارے معاشرے مین اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئک هم الکفرون (۵/۴۴)۔

جولوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کوکافرکہا جاتا ہے۔

☆☆☆

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ و نصیحت یا تقاریر وخطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کوالٹ کراس کی جگہ نظامِ خداوندی

کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وجعل کلمة الذین کفروا السفلیٰ و کلمة الله ہی العلیا (۹/۴۰)۔

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

ھو الذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کله ولو کره المشرکون (۹/۳۳)۔

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ محمد رسول الله والذین معه (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے **الاعلیٰ** اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں **الاعلون** کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین (۳/۱۳۸)۔ ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے ان کنتم مومنین کی شرط عائد کر دی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں، کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا

کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

ولن یجعل اللہ للکٰفرین علی المومنین سبیلا (۴/۱۴۱)۔

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: انتم الاعلون۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلی میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلی۔۔ الاعلی کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں' جو ہمیں الاعلون کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے' مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

ساصرف عن اٰیٰتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق (۷/۱۴۶)۔

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لتکبرو اللہ علی ماھدٰکم۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا

پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟۔۔۔لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہٰی دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ شھر رمضان الذی انزل فیہ القران (۲/۱۸۵)۔ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمٰی قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذٰلک فلیفرحوا۔ ھو خیر مما یجمعون۔ (۱۰/۵۸)۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عیدالفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزں کا مقصد۔ یعنی لتکبرو

اللہ علی ماھذکم ۔تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تاکہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ وفغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگسؔ کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر' دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار' اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا' **اشھد ان لا الٰہ** اسی کا

قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے **اشهد ان لا الٰه الا الله** کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ **شهد الله انه لا الٰه الا هو**۔ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' **والملٰئكة** ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں' کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: **واولوا العلم قائما بالقسط**۔ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ **لا الٰه الا هو العزيز الحكيم** (۳/۱۷) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں' بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنادینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزان من' میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض وغایت اور رمضان کا مقصود ومنتہیٰ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

سورۃ الاخلاص (آیات 1 تا اختتام)

(بزم طلوع اسلام لاہور کی مساعی سے جو سلسلہ ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' کا شروع کیا گیا تھا اس سلسلے کی تیسویں پارہ کی سورتوں کے دروس کی تسوید بھی چھپ کر آ گئی ہے۔ ''مطالب القرآن فی دروس الفرقان'' تیسواں پارہ کی آخری تین سورتوں پر مشتمل پرویز صاحب کے دیے گئے دروس آپ کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! اب سورۃ الاخلاص شروع ہوتی ہے۔ یہ تیسویں پارے کی 112 ویں سورۃ ہے۔اس میں اسباب وعلل کی حقیقی بنیاد کا ذکر ہے۔

اسباب وعلل کی حقیقی بنیاد

قرآن یہاں پہنچنے کے بعد نگاہوں کا رُخ ایک اور حقیقت کی طرف پھیر دیتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ان اسباب وعلل کی ضرورت ہے' دنیا عالمِ اسباب ہے۔ان میں یہ چیزیں ہونی چاہئیں لیکن یہی چیزیں کافی نہیں ہیں۔اس کے لیے بنیاد ایک اور ہے۔ اس بنیاد کے اوپر اگر یہ تمام اسباب وعلل اٹھیں گے تو پھر اس قسم کے نتائج پیدا ہوں گے۔اگر وہ بنیاد باطل ہے' کمزور ہے تو یہ اسباب و علل وقتی طور پہ تو کچھ کامیابیاں دے سکتے ہیں لیکن وہ اس قسم کا نقشہ مرتب نہیں کر سکتے جیسا نقشہ یہ نظام اب مرتب کرے گا۔وہ بنیاد کون سی ہے؟ عزیزانِ من! جب میں وہ بنیاد ''ایمان'' کہوں گا تو ذہن میں یہ بات جلدی سے آئے گی لیکن حقیقت وہی ہے۔یہ ساری چیز' یہ سارا نقطہ ماسکہ' یہ بنیادِ اول' یہ علت العلل' یہ خدا پر ایمان' اس حقیقت کے غماز ہیں لیکن پھر بھی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ہم میں سے وہ کون ہے جس کا خدا پر ایمان نہیں ہے؟ خدا پر تو سب ایمان رکھتے ہیں' یہ اہل یورپ (European) بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ دنیا میں چند دہریوں کو چھوڑ کر ساری دنیا خدا پر ایمان رکھتی ہے' تو پھر یہ بات کیا ہوئی؟

اصل چیز خدا پر ایمان نہیں بلکہ خدا کا صحیح تصور ہے

خدا پر ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو پھر اسلام سمجھ میں آ جاتا ہے اور اسی سے مذہب کا تصور بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اور وہیں سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کس طرح سے الگ الگ ہو گئے۔اصل چیز خدا پر ایمان نہیں ہے' اصل

چیز خدا کا صحیح تصور ہے۔ اس کے متعلق جو Concept (تصور) ہے، وہ ہے کیا؟ وہ کس قسم کا خدا ہے جسے ہم مانتے ہیں؟ اور اگر کوئی پوچھے کہ عزیزانِ من! قرآن کی تعلیم کا نقطہ ماسکہ کیا ہے؟ کہا جائے گا کہ اس نے خدا کا صحیح تصور دیا ہے۔ مذہب میں جس طرح خدا کا نام ہوتا ہے۔ اس کا سارا تصور (Concept) بدل دیا جاتا ہے۔ قرآن اتنا ہی نہیں کہتا کہ خدا کو مانو، وہ ان سب ایمان والوں سے جو خدا کو ماننے والے ہیں، حتیٰ کہ جو اہلِ کتاب ہیں، جو کتابوں کو بھی مانتے تھے، جو رسولوں کو بھی مانتے تھے، ان کے متعلق بھی یہ کہتا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ خدا پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو پھر ان کو ایمان والا کہا جائے گا، تو پھر یہ راہِ ہدایت پر ہوں گے یعنی محض کسی کا یہ کہہ دینا کہ میں خدا کو مانتا ہوں، کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم کس قسم کے خدا کو مانتے ہو؟

مذہب کے ہاں خدا کا تصور

ایک خدا مذہب کے تصور والا ہے جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے، نہ کوئی قانون ہے، نہ کوئی آئین ہے، اور نہ کوئی دستور ہے۔ اللہ بے پرواہ ہے بلکہ لاپرواہ ہے، جو جی چاہے کردا ائے، جو جی آوے کیندا ائے، ہن کچھ کیندا ائے، کدی کچھ کر دیندا ہیگا۔ [1] یہ وہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں (معاذ اللہ) کہ اسے خاصا ایک مہاراج رنجیت سنگھ (1839-1780) بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔ ''اسے پھانسی دے دو، اسے گاؤں بخش دو'' یہ وہی ہے جو سعدی (1291-1184) نے کہا ہوا ہے کہ مزاج شاہاں [2] ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی گالی دیدے تو ان کو خلعت بخش دیدیتے ہیں، کبھی کوئی سلام کردے تو اسے پھانسی پہ چڑھا دیتے ہیں۔

مزاج شاہاں جو ہوا صاحب! بادشاہ کا یہ تصور جو ہوا۔ کہنے کو تو مذہب میں یہ کہا گیا تھا کہ **السلطان ظل اللہ علی الارض** بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے لیکن حقیقت میں انہوں نے خدا کو اس زمین کے بادشاہ کا سایہ بنا کر رکھ دیا ہوا ہے۔ جس قسم کا ان کے ہاں بادشاہ ہوتا ہے انہوں نے اس قسم کا بلکہ ذرا Magnify (اصل سے بڑھا) کر کے خدا بنا دیا۔ ہندوؤں کے ہاں راون کے دس سر بنایا کرتے ہیں۔ ان سے کہا کہ صاحب! یہ کس طرح؟ انہوں نے کہا کہ جب اس کا قد نوے فٹ کا تھا تو سر بھی تو کم از کم دس ہونے چاہئیں۔ کالی دیوی کے چار ہاتھ ہوتے ہیں کہ صاحب! اس نے تو قتل عام کرنا ہے، ایک ہاتھ سے قتلِ عام ہو نہیں سکتا، اس لیے اس کے

---

[1] جو جی چاہے کرتا ہے، جو جی میں آئے کہتا ہے، اب کچھ کہتا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد کچھ اور کر دیتا ہے۔

[2] نازک مزاجِ شاہاں، تابِ سخن ندارد

چار ہاتھ ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن میں اس دنیا کے اندر یہ چیز ہے کہ انسان نے جس قسم کے انسان دیکھے، جب اس قسم کا خدا بنانا چاہا تو اس کو ان سے ذرا بڑا بنا کے دکھا دیا۔ مذہب کرتا ہے یہ ہے۔

تخت پہ بیٹھا ہوا خدا، وسیلوں، شفارشوں اور نذر و نیاز قبول کرنے والا خدا ہے

مذہب کے سامنے انسان ہوتا ہے۔ اِس میں انسان کو Magnify (اصل سے بڑا) کرتے ہیں یعنی اسے بہت بڑا سا بنا دیتے ہیں، اب یوں ہے کہ گویا وہ تختِ حکومت پہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہاں بھی بادشاہ تخت پہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد امیر، وزیر، مشیر، سارے کے سارے، بیٹھے ہوئے ہیں۔ باہر دور تک دربان ہیں۔ کوئی اس تک براہِ راست پہنچ نہیں سکتا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے وسیلے ڈھونڈنے پڑتے ہیں پھر یہ جو اس کے قریبی ہوتے ہیں جن کو وہ مقربین کہتے ہیں ان کی سفارشیں ڈلوانی پڑتی ہیں، یہ ان کی عرضیاں جا کر پیش کرتے ہیں۔ انہیں نذرانہ دینا پڑتا ہے، اس کے حضور میں قصیدے گزارنے پڑتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ بعینہٖ وہی نقشہ ہے جو کہ ایک مستبد شہنشاہیت کا تھا۔ یہ تصور تھا جو خدا کا دے دیا گیا۔ اس تصور کے ماتحت انسان کی کیفیت وہی ہے جیسے ایک Dictator (مستبد) کے سامنے رعایا کی ہوتی ہے۔ ہر وقت ڈرتے، کانپتے، ہانپتے ہیں۔ جو بات ہو اس کے لیے پہلے یہ دیکھیے کہ وہ کیا چاہتے ہیں

اگر شہ رو ذرا گریز شاہ بستیں
دیبائے گفت نیمت بائے برزیں

سعدی (1184-1291) کہتا ہے کہ اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو کہیے سرکار! دیکھیے، چاند نکلا ہوا ہے، ستارے چمک رہے ہیں سبحان اللہ۔ یہ ہے وہ خدا جس کو ماننے سے اہلِ مذہب طبقہ لوگوں کو خدا پرست کہتا ہے۔ کتنی دور چلا گیا انسان! اور اس خدا کے ماننے میں کتنا ذلیل ترین مقام خود انسان کا رہ گیا!!

دین میں خدا کا تصور اور افراد سے لے کر اقوام تک کی موت و حیات کے پیمانے

ایک دین کا خدا ہے کہ جس کی عظمتوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کہتا یہ ہے کہ ہماری بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کے اظہار کے لیے ہم نے کچھ قوانین مرتب کر دیئے ہیں، یہ ساری کائنات ان قوانین کے تابع چلتی ہے اور قادرِ مطلق ہونے کے باوجود، ہم نے اپنے آپ پر اتنی پابندی عائد کر لی ہے کہ اب ہم بھی ان قوانین کے خلاف کبھی نہیں کرتے۔ اس کے مقابلے میں انسان ہے۔ اُسے کہا ہے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18:29) تم میں سے جس کا جی چاہے ان قوانین کو اختیار کرے، جس کا جی چاہے اس کی

خلاف ورزی کرے۔ اسے اِن کی خلاف ورزی کرنے کا بھی اختیار دیا ہوا ہے۔ اور اپنے اوپر اتنی بڑی پابندی عائد کی ہوئی ہے کہ ہم اس کے خلاف نہیں کریں گے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ خدا کیا ہے۔ اس معاشرے کے اندر اس قدر امن ہوتا ہے' جہاں ہر فرد کو یہ معلوم ہو کہ یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوگی' نہ کسی کی شفارش چلے گی' نہ یہاں رشوت چلے گی' نہ نذرانے ہوں گے' نہ کفایت سے اس کا دل موہ سکیں گے۔ ان کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو یہ ہے کہ ہر شے قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی چلی جائے۔ خدا کا یہ تصور ہے۔ پھر افراد ہی کی نہیں' اقوام کا عروج و زوال اور موت و زندگی بھی انہی قوانین کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو قوم ان کے مطابق یہ کچھ کرے گی' سربلندیاں حاصل کرلے گی' جو اس کی خلاف ورزی کرے گی اس کو زوال آ جائے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت' کسی ایسی قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی' جو ان قوانین کی خلاف ورزی کرے۔ یہ ہے خدا کا تصور اور آگے بڑھیے تو خدا اور انسان کا تعلق آتا ہے۔ انسان بھی حیوانات کی ایک بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی جسمانی زندگی دیکھیے تو وہ بالکل حیوانات کی طرح ہے: اسی قسم کی مشینری ہے' وہی طبعی قوانین ہیں' انہی کے مطابق یہ چلتا ہے۔ مگر ایک فرق ہے۔

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ انسان کو اس کی ایک Personality یعنی ذات دی گئی ہے۔ حیوانات میں یہ چیز نہیں ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے یہ صاحبِ اختیار وارادہ بنتا ہے۔ یہی چیز شرفِ انسانیت ہے۔ اب انسانی ذات کی کچھ بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ انہیں قرآن نے کس طرح بیان کیا ہے؟ سنیے! یہ کہا کہ خدا کی بھی ایک ذات ہے۔ ہم اسے ذاتِ خداوندی کہتے ہیں یعنی خدا کی ذات۔ جیسا میں نے کہا ہے کہ ذات یا Personality کے کچھ Basic Characteristics یا بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ذات جہاں بھی ہوگی اس کی وہی خصوصیات ہوں گی۔ خدا کی ذات کے متعلق صرف یہ ہے کہ وہ مکمل ترین ذات ہے' اس لیے اس میں وہ خصوصیات اپنی انتہا تک پہنچی ہوئی ہیں' انسان کو جو ذات دی گئی ہے تو حدودِ بشریت کے اندر وہ خصوصیات خود انسان کے اندر موجود ہیں۔

صفاتِ خداوندی اور ذاتِ انسانی کا باہمی ربط اور حدود

یہ انسان اس کائنات میں ایک چھوٹے سے Miniature Form (سمٹی ہوئی شکل) میں' چھوٹے سے پیمانے پر' خدائی صفات کا حامل ہے۔ قرآن میں جن چیزوں کو صفاتِ خداوندی کہا گیا ہے وہ ذات کی صفات ہیں۔ وہ صفات خدا کے اندر

Perfection (تکمیل) تک پہنچی ہوئی ہیں مگر انسان کے اندر حدِ بشریت تک محدود ہیں لیکن ہیں وہی خصوصیات۔ قرآنِ کریم نے سورۃ اخلاص میں خدا کی ذات کی بنیادی تین یا چار خصوصیات گنائی ہیں۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ ایک تو خدا کا تصور صحیح آ جائے اور دوسرا یہ کہ انسان کو خود معلوم ہو جائے کہ میری ذات اس وقت نشو ونما یافتہ سمجھی جائے گی جب میرے اندر بھی یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی۔ پہلی خصوصیت کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (112:1)۔

''واحد'' اور ''احد'' میں بنیادی فرق ہے

ہمارے ہاں تو اس هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کا ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ ''کہہ دے اللہ ایک ہے''۔ بات ایک سے نہیں ہوتی۔ عربی زبان میں واحد کے لیے بھی ''ایک'' آتا ہے۔ مگر یہاں یہ لفظ ''احد'' ہے۔ اس ''واحد اور احد'' میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سینکڑوں انسانوں میں سے ایک انسان آپ کے سامنے آئے تو وہ واحد ہو جاتا ہے: ایک انسان آیا ہے۔ ان دس آدمیوں میں سے ہمارے سامنے ایک آیا لیکن ''احدیت'' کے معنی ایک ہونا ہی نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہے جسے ہم انگریزی زبان میں Unique کہتے ہیں' اسے عام طور پر ہمارے ہاں ''یگانہ'' کہتے ہیں۔

خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے' Unique ہے

Unique وہ ہوتا ہے ''جو اپنے اندر وہ کچھ ہو کہ کوئی دوسرا ویسا نہ ہو'' اس کے اندر اس کی انفرادیت ہوتی ہے' اس کے اندر Individuality ہوتی ہے۔ یہاں یہ کہا ہے کہ وہ Unique ہے' یگانہ ہے' اس میں انفرادیت کی بات یوں سمجھ میں آ سکتی ہے۔ ہر انسان میں جسے وہ اپنے آپ کو ''میں'' کہتا ہے' اس کی وہ ''میں'' یگانہ ہوتی ہے: میرے احساسات' میرے اندر کی کیفیات کسی دوسرے کی نہیں ہوتیں' کوئی دوسرا ان کو بانٹ نہیں سکتا' کوئی اِن میں شامل نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میرا درد میرا درد ہوتا ہے' کوئی دوسرا اس کو محسوس نہیں کر سکتا' ہمدردی تو اس سے کر سکتا ہے' میرے تاثرات میرے ہوتے ہیں۔ اسے انفرادیت کہا جاتا ہے' Individuality کہا جاتا ہے اور یہی Individuality ہے کہ جس پہ یہ سارا قانونِ مکافاتِ عمل چلتا ہے: میرے ہر عمل کا نتیجہ مجھے بھگتنا ہوگا' کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اسے کہتے ہیں Unique ہونا' Individual ہونا' انفرادیت لیے ہوئے ہونا۔ فلاں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے' Unique ہے' کوئی اس جیسا نہیں ہے۔ یہ تو افراد کی انفرادیت ہے۔

صفاتِ خداوندی کی حامل قوم بھی دنیا میں Unique ہوتی ہے' احد ہوتی ہے

جب کوئی قوم خدا کی اس صفت کو اپنے اندر منعکس کر لے تو وہ خود دنیا کے اندر ایک Unique قوم ہو جاتی ہے اور یہ حقیقت ہے برادرانِ عزیز! کہ جس طرح سے ایک مردِ مومن انسانوں کے اندر Unique ہوتا ہے' اسی طرح سے مومنوں پر مشتمل جو جماعت ہوتی ہے وہ اقوام کے اندر Unique ہوتی ہے۔ تاریخ میں بڑی بڑی بلند تہذیبیں بھی آپ کو نظر آئیں گی' بڑی بڑی سلطنتیں بھی آپ کو نظر آئیں گی لیکن ہم سے نہیں غیر مسلموں سے پوچھو کہ نبی اکرم ﷺ اور حضورؐ کے رفقا رضی اللہ عنہم کی جو جماعت پیدا ہوئی تھی' غیر مسلم Historian (مورخین) بھی جب وہاں آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اس جماعت کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (112:1) ماننے والی جماعت کی خصوصیت ہے کہ اس جیسی جماعت من حیث کل تاریخ میں کہیں نہیں ملتی: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ [1] (112:1)۔

ذات کی دوسری بنیادی خصوصیت: صمدیت

سورۃ الاخلاص کی دوسری آیت ہے: اَللّٰهُ الصَّمَدُ (112:2)۔ ذات کی دوسری بنیادی خصوصیت اس کی ''صمدیت'' ہے۔ یہ ہے وہ ''صمد'' جس کا ترجمہ ''وہ بے پرواہ ہے'' کیا جاتا ہے' وہ ''بے نیاز'' ہے کیا جاتا ہے۔ ''صمدیت'' ایک ایسی محکم چٹان کو کہتے ہیں ''جو اپنی حفاظت کے لیے کسی کی محتاج نہ ہو لیکن جب چاروں طرف سے سیلاب آ جائے تو ہر شخص اس کے اوپر جا کر محفوظ ہو جائے۔'' یہ ہے صمدیت جو خود اپنی حفاظت کے لیے کسی کی محتاج نہ ہو' اپنے پاؤں پر جم کر کھڑی ہوئی' حوادثِ زمانہ کی متلاطم لہریں آئیں' سر ٹکرا کر' پاش پاش ہو کر' واپس چلی جائیں' اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں اور جب کسی کو کہیں پناہ نہ مل سکے تو یہ اس کو پناہ دے۔ یہ ہے صمدیت' عزیزانِ من! جب کسی فرد کے اندر خدا کی یہ صفت منعکس ہو' سوچیے تو اس کے اندر کتنی بڑی حریت اور آزادی آ جائے گی: اپنے لیے کسی

---

[1] (اس سلسلہ میں' خود اپنے لوگوں پر بھی اس بنیادی حقیقت کو واضح کر دینا چاہیے کہ تمہاری ہر فتح اور کامرانی' محض فوجی طاقت کے بل بوتے پر نہیں۔ یہ کامیابی دراصل اس تعلیم کا نتیجہ ہے جسے تم علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کرتے اور دلائل و براہین کی رو سے منواتے ہو۔ اس تعلیم میں بنیادی نکتہ خدا کے تصور کا ہے۔ خدا کے جس تصور کو تم پیش کرتے ہو' ہو نہیں سکتا کہ انسان اس پر عقل و فکر سے غور کرے' اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ وہ تصور یہ ہے کہ خدا واحد' اپنی ذات اور صفات میں یگانہ (Unique) ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ساری کائنات میں اسی ایک کا قانون کارفرما ہے اور اسی ایک کے قانون کے تابع تمام انسانوں کو بھی رہنا چاہیے۔ اس طرح ان میں بھی وحدت پیدا ہو جائے گی۔ (وحدتِ خالق کے تصور کا لازمی نتیجہ وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت ہے)

کامحتاج نہ ہواور ہرمحتاج کے لیے یہ آسرا بن جائے اور جب دنیا میں اس قسم کی کوئی قوم وجود میں آجائے تو پھر حوادثِ زمانہ کے تلاطم میں ڈوبنے والے انسانوں کے لیے یہ چٹان جو کچھ کرے گی اُسے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہے اَللّٰہُ الصَّمَدُ [1] (112:2)۔

ذاتِ انسانی تولید کی پیداوار نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اس ذاتِ خداوندی کی اگلی کیفیت یہ ہے کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (112:3)۔ بڑی بنیادی حقیقت اس کے اندر بیان کی گئی ہے۔ حیوانات تک افزائشِ نسل کا سلسلہ تولید کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ محض Biological Recreation (حیاتیاتی تولید) ہے، جیسے بیٹا پیدا ہوتا، جیسے جانور کے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اسے تولید کہتے ہیں۔ Recreation (تولید) تو Life (زندگی) کی Basic Instinct (بنیادی جبلت) میں سے ہے۔ زندگی جہاں بھی ہے، وہ اپنے جیسا پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اسی سے اس کائنات کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ انسانی زندگی کے اندر بھی نسلِ انسانی کی پیدائش تولید کے سلسلے سے ہوتی ہے۔ باپ کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں انسان اور حیوان مشترک ہیں۔ اس میں کوئی چیز بھی وجہ شرفِ انسانیت نہیں ہے۔ خدا کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ نہ تو اس سلسلہ تولید کی تخلیق ہے، نہ اس کے بعد اس کو سلسلہ تولید سے تعلق ہوتا ہے۔ انسانی ذات اس طرح سے نہیں پیدا ہوئی جیسے انسانی جسم پیدا ہوا ہے۔ انسانی جسم سلسلہ تولید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ذات یا Personailty تولید کے ساتھ نہیں پیدا ہوتی۔ اگر یہ آتی تو ہر حیوان کے اندر ہوتی۔ یہ خالص انسانی جذبہ ہے۔

تولید میں یہ چیز آتی ہیں اسی لیے خدا نے اس تولید کے سلسلے کو جسمِ انسانی کے لانے کے بعد کہا کہ فَنَفَخْنَا فِیْھَا مِنْ رُّوْحِنَا (21:91) ہم نے اپنی توانائی کا ایک شمہ انسان کو دے دیا۔

انسانی ذات جسم کا حصہ نہیں بلکہ خدا کی توانائی کا ایک شمہ ہے

ہم نے اپنی توانائی کا ایک شمہ انسان کو دے دیا۔ یہ تولید کے ذریعے نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ذات تولید کے سلسلے سے بے نیاز ہوگئی۔ خدا نے اپنے آپ کو خالق کہا ہے۔ جو تخلیق ہے وہ Creation ہے، تولید Recreation ہے۔ Recreation (تولید) ہر حیوان کرسکتا ہے۔ تخلیق کوئی حیوان نہیں کرسکتا۔ یہ خالصتاً انسان کے لیے ہے: اوپر خدا کے لیے اور نیچے انسان کے لیے، اسی لیے خدا نے

---

[1] وہ (خدا) خود مکتفی ہے اور باقی سب اپنی زندگی، بقا، نشوونما اور تکمیل کے لیے اس کے محتاج ہیں۔ وہ ایک بلند و بالا مستحکم چٹان کی طرح ہے جو خود ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہوتی ہے اور سیلاب سے بچنے کے لیے ہر ایک اُس کی طرف پناہ کے لیے جاتا ہے۔ (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے کہ خالق تم بھی ہو، تمہیں ہونا چاہیے، ہماری تخلیق حسین ترین ہوتی ہے، تمہاری ذرا نیچے کے درجہ کی ہوتی ہے۔ انسان اور حیوان میں عزیزانِ من! یہاں فرق شروع ہوا کہ اگر یہ بھی اپنی زندگی کا مقصد تولید ہی رکھتا ہے، بچے پیدا کیے، ان کی پرورش کی، یہ خالص حیوانی چیز ہے۔ یہ اگر تخلیق نہیں کرتا تو انسان کے درجہ پر نہیں پہنچتا۔

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

اس کائنات کا حسن سنورتا ہی Creation (تخلیق) سے ہے۔ یہ Creative (تخلیقی) یا Creative art (تخلیقی فن) ہے۔ یہ انسانیت کا شرف ہے۔ اس لیے کہا کہ **لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ** [1] (112:3)۔ یہ ٹھیک ہے کہ حیوانی تولید کا سلسلہ افزائشِ نسلِ انسانی کے لیے ضروری ہے مگر یہ وجہ شرفِ انسانیت نہیں ہے۔

شرفِ انسانیت تخلیق کے اندر ہے

شرفِ انسانیت یہ ہے کہ تم نے کیا Create (تخلیق) کیا ہے؟ سوچیے تو سہی، جو قوم تقلید کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی چلی آ رہی ہو، اس میں تخلیق کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ تخلیق تو نئی چیز پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ جس قوم میں Innovation (نئی نئی چیزوں کی اختراع) حرام قرار دی جائے، جس قوم میں ہر خطبہ کے اندر اعلان کیا جائے کہ **کل بدعة ضلالة** ہر نئی چیز گمراہی ہے، اس میں تخلیق کیسے آ سکتی ہے؟ تقلید حیوانات میں ہوتی ہے۔ جس قسم کی بکری پہلے دن تھی، آج بھی اس قسم کی بکری پیدا ہو رہی ہے۔ ہر بکری اپنی ماں یا باپ کی طرح ہوتی ہے، مقلد ہوتی ہے، وہ گھاس کھاتی، یہ بھی گھاس کھاتی، وہ میں میں کرتی ہے، یہ بھی وہی کرتی ہے لیکن جہاں تخلیق ہوتی ہے وہاں تو ہر آن اس سے ایک کارِ نادر وجود میں آتا ہے اور یہی وجہ ہے جو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ:

گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

---

[1] اس نے تمام ذی حیات عملِ تخلیق (Creation) سے پیدا کیا، نہ کہ تولید (Recreation) کے ذریعے (عمل تولید میں پیدا کرنے والے کا ایک حصہ مولود میں آ جاتا ہے، اور اس طرح والد یعنی پیدا کرنے والا خود ناقص رہ جاتا ہے۔ تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا) نہ اس نے اس طرح کسی کو پیدا کیا ہے، نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اقبالؒ کا اندازِ بیاں

تو زندگی کے اندر کوئی تخلیقی کارنامہ کر جا۔ اللہ کی ''شریعت'' بقول ان کے اگر اس کو گناہ بھی کہتی ہے تو مت گھبرا۔ یہ تخلیقی کارنامہ ثواب ہے اور اس کے بعد کہا کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (112:3) ہمارے ساتھ خدا کا تعلق تولیدی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے جتنے تعلقات ہیں وہ سارے تولید کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے اونچے ہو جاؤ۔ اپنے بچے کو تو بکری بھی پالتی ہے۔ اگر تم بھی اس دائرے میں گھرے رہے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو خدا کی صفت تم میں نہیں آئی۔ یہ حیوانی صفت ہے' ہمارے سارے تعلقات تولید (Recreation) کے ہوتے ہیں۔ ہم اس سے آگے جاتے ہی نہیں اور آگے بڑھے تو قرآنِ کریم نے انسانیت کے اندر Race (نسل) کے تصور کو کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ نسل کا تصور خالص تولید (Recreation) پر ہوتا ہے۔ ایک نسل کا یعنی ایک Race کا ہونا تولید ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے اونچے ہو جاؤ' دنیا کی جو قومیں Race (نسل) قبیلے اور خاندان کی بنیاد پہ بنتی تھیں وہ عمل تولید تھا اور اس نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ ایمان کی بنیادوں کے اوپر ایک نئی قوم بناؤ۔ یہ تخلیقی چیز ہے' Ideology (ایمان) کے Basics (بنیاد) پر قوم بناؤ' اس لیے کہ تمہارے ساتھ خدا کا تعلق تولید سے نہیں ہے' تم اس کے جنے ہوئے بیٹے نہیں ہو لیکن اس کے باوجود ربوبیتِ عالمینی اس نے اپنے لیے رکھی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے تم بھی ربوبیت کو یونہی لو۔

عالمی نظامِ ربوبیت کا تصور تولید نہیں تخلیق ہے

اپنے بیٹے کو پالنا تو ہر حیوان کر لیتا ہے' دنیا کے بیٹوں کو اپنے جیسا سمجھو اور ان کو پالو۔ یہ ہے خدا کی ''صفتِ تخلیق''۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (112:3)۔ بس مختصراً یہ سمجھو۔' پھر اس نے کہا کہ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (112:4) اس کا ہمسر' مثیل اور نظیر کوئی نہیں۔ اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے کسی شے میں کسی کی نظیر یا مثیل ہونے کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ (42:11) اگر تم کوئی بھی تصور کرو' تو یہ تو ٹھیک ہے کہ وہ خدا کی کسی صفت کا پرتو تو ہو سکتا ہے لیکن خدا اس سے بڑا اونچا ہوگا۔ وہ اس کی نظیر نہیں ہوگی' مثیل نہیں ہوگا۔ وہ تو ساری کائنات میں ایسا ہے اس کے ماننے والے عبدِ مومن کے اندر بھی یہ خصوصیات ہونی چاہئیں مگر اس میں وہ خصوصیت ہے جو کسی دوسرے میں اس نظیر و مثیل کی نہیں آتیں' پھر ان خصوصیات کے حامل جن افراد پر قوم مشتمل ہو' اس قوم کی کیفیت یہ ہو کہ وہ بے مثال' بے نظیر ہے۔ دنیا کے اندر وہ قوم ہونی چاہیے۔ قرآن کریم نے کہا کہ ان سے کہو کہ یہ ہے وہ خدا جس کے تصور نے ہمیں یہ سارا کچھ عطا کر دیا جس کو تم آج دیکھ رہے ہو۔

ایمان، عزیزانِ من! یونہی چار کلمے دہرا دینے کا نام نہیں ہے۔ ایمان نام ہے قانون کی محکمیت پر Conviction (یقین)۔ جب کسی Scientist (سائنسدان) کو یہ Conviction (یقین) حاصل ہو جائے کہ یہ قانون ایسا کرے گا تو پھر اس کے لیے وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتا ہے، تجربے کرتے کرتے کسی مقام پہ رکتا نہیں ہے، جب تک کہ وہ اس کو کامیابی تک نہیں پہنچا دیتا۔ پہنچا تا اس صورت میں ہے کہ جب اسے یقین ہو اور اگر اسے یہ یقین ہی نہ ہو تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے کہ نہیں صاحب! اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ جب قانون پہ یقین ہوتا ہے تو ناکامی کے بعد وہ یہ سوچتا ہے کہ میری کسی تدبیر میں خامی رہ گئی جو نتیجہ پیدا نہیں ہوا، ورنہ قانون نے نتیجہ پیدا کر دینا تھا۔ اسے کہتے ہیں ایمان۔ اس قسم کے خدا پر ایمان نے کہا ہے کہ ان سے کہدو کہ ہماری ان کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز یہ ہے کہ ہم اس قسم کے خدا پر ایمان لائے ہوئے ہیں جو ''احدیت'' کا خدا ہے ''صمدیت'' کا خدا ہے، اور ''تولید سے بلند و بالا رب العالمین'' ہے، وہ بے مثل و بے نظیر خدا ہے۔

صفاتِ خداوندی کی حامل قوم ہی قوموں کی امامت کے قابل ہوگی

اس کے ماننے والی قوم کے اندر اس قسم کی خصوصیات کا پرتو ہونا چاہیے۔ تم جو انہیں ایسا دیکھ رہے ہو تو اس لیے دیکھ رہے ہو کہ ہم اس آئینے کے عکس میں ہیں۔ جو بھی یہ بات اپنے اندر پیدا کرے گا اس کی یہی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ کہا کہ کہیں خالص مادی اسباب کے اوپر نہ رہ جانا۔ سارے مادی اسباب تو لیبارٹری میں موجود ہوتے ہیں، اگر Scientist (سائنسدان) کے پاس Law (قانون) نہیں ہوتا ہے تو مادی اسباب کچھ نہیں کیا کرتے۔ کہا کہ یہ یقین کامل ہے جس کی وجہ سے ہمیں یہ سارا کچھ حاصل ہوا ہے۔ اب یہاں پہنچنے کے بعد امتِ مسلمہ باقی اقوامِ عالم سے منفرد ہو گئی کہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی بنیاد اس ایمانِ خداوندی کے اوپر ہے اور خدا پر ایمان بھی مذاہب کی دنیا سے منفرد ہو گیا۔ وہاں مذاہب میں خدا کا تصور کچھ اور ہوتا ہے، یہاں دینِ اسلام میں خدا کا تصور کچھ اور دیا گیا ہے۔

عزیزانِ من! فتح و نصرت آ گئی، نظام متشکل ہو گیا، مخالفتوں اور عداتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اب بنیاد بتا دی کہ تمہارے ہاں کی وہ بنیاد کونسی تھی۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد ایک اور مرحلہ آگے آیا کرتا ہے۔ جس دن ڈاکٹر صاحب یہ بتا دیتے ہیں کہ لو بھئی، اب تمہاری بیماری بالکل چلی گئی تمہیں بالکل شفا ہو گئی، اس کے بعد کچھ اور بھی ساتھ کہا کرتے ہیں۔ کہا یہ کرتے ہیں کہ یاد رکھو! آئندہ تم نے یہ یہ چیزیں نہیں کھانی، تم نے یہ یہ کچھ نہیں کرنا۔ یہ ہوتی ہے آخری چیز۔

آخر میں حفاظتی تدابیر کی تاکید

عزیزانِ من! اب یہ دو آخری سورتیں آ گئیں کہ اب بیمار اس بیمار خانہ سے شفا پانے کے بعد جا رہا ہے اور اسے آخری وقت میں طبیب کہہ رہا ہے کہ سنو! یہ سب کچھ تمہیں حاصل ہو گیا۔ اب اس کے بعد تم نے کچھ Precautionery Measures (اقداماتِ حفظ ماتقدم) لینے ہیں' حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہیں تاکہ یہ نظام ٹوٹ نہ جائے' یہ مستحکم رہے' آگے بڑھے۔ آپ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! کہ پروگرام میں اس آخری کڑی کا پروگرام اس قدر تکمیل پہ پہنچا دیتا ہے۔ بات یہاں تک ختم ہو گئی تھی' کامیابی حاصل ہو چکی تھی' نظام متشکل ہو گیا تھا' اس کی بنیاد بتا دی گئی تھی لیکن ضرورت سمجھی گئی کہ نہیں' ان چیزوں سے محتاط رہنا بھی بتایا جائے اور پیغام کے مکمل ہونے کی دلیل ہی یہ ہو سکتی ہے کہ وہ وقتی شفا نہ دے' آئندہ کے لیے احتیاطی تدابیر بھی بتائے۔

عزیزانِ من! اب وقت ختم ہوا۔ یہ آخری دو سورتیں ہم آئندہ لیں گے۔

سورۃ الفلق (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَعُوْذُ کا مفہوم

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (113:1)۔ عزیزان من! اعوذ بڑا عجیب لفظ ہے۔ مرغی کے نئے بچے اس کے ساتھ چپکے پھرتے ہیں۔ جونہی کہیں کسی چیل کا سایہ زمین پر پڑے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ بھاگ کر کس طرح مرغی کے نیچے آ جاتے ہیں۔ ہر جانور کا نوزائیدہ بچہ' اگر کہیں خطرے کی آواز سنے تو بھاگ کر ماں کے ساتھ چمٹ جاتا ہے۔ اُدھر سے ماں بھی دوڑ کر اس کو اپنے پروں کے نیچے لے لیتی ہے۔ اس طرح سے نوزائیدہ بچے کا خطرے کے وقت' اپنی ماں کی آغوش میں سمٹ کے آ جانا' عَوَذَ کہلاتا ہے۔ اسی سے تعوذ اور تعویذ کے الفاظ آتے ہیں۔

کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو! دنیا میں تمہارے مخالفین کی بڑی بڑی جماعتیں پیدا ہونگی۔ تم نے ایسا انقلاب برپا کیا ہے جس نے ان بڑے بڑے سرمایہ داروں کا' مذہبی پیشوائیت کا' بڑی بڑی حکومتوں کا' خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔ تمہارے نظام کو نقصان پہنچانے کے لیے چاروں طرف سے یورشیں ہونگی۔ جب کہیں یورش ہو' کہیں خطرہ نظر آئے تم وہی کرنا جو ایک نوزائیدہ بچہ کرتا ہے! جونہی خطرہ نظر آئے خدا کے قوانین کی طرف بھاگ کر آ جانا' لپک کر آ جانا۔ یہ ہے تعوذ جو ہمارے ہاں رسم بن کر رہ گیا ہے کہ قرآن کی تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ

بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھ لیا اور کچھ پتہ نہیں کہ یہ ہے کیا جو پڑھا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ کہ ''میں پناہ مانگتا ہوں شیطان سے'' یعنی اس کی عظمت وقوت کا اعتراف ہو رہا ہے۔ یہاں تک تو یہ صرف ایک رسم ہے۔ آگے یہ لفظ تعویذ ہے جو اسی لفظ عَوَذَ سے نکلا ہے: لکھ کر گلے میں ڈالے دیجیے، مکان کے باہر کیل ٹھونک کے لٹکا دیجیے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ حقیقت خرافات میں کھو گئی۔

سورۃ الفلق اس آیت سے شروع ہوتی ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (113:1)۔ اس رب کے قانون کی طرف آؤ۔ جہاں بھی کوئی مقام بوسیدہ ہو جائے، اسے آپ نے پھر سے محکم و مستحکم بنانا ہو، تو پہلے آپ اس عمارت کو گراتے ہیں، اس کی بنیادوں تک کو اکھیڑ دیتے ہیں۔ بظاہر یہ تخریب ہوتی ہے۔ دراصل یہ تخریب نہیں تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ ایسا کیا جائے۔

فلق کا مفہوم

جب آپ زمین میں دانہ، بیج کی طرح، بو دیتے ہیں تو چار دن کے بعد دیکھیے تو وہ دانہ اس زمین میں اُس حالت میں ہوتا ہی نہیں، وہ پھٹ گیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہہ دیں گے کہ ہائے یہ تو ضائع ہو گیا اِسی بلڈنگ کو جو گرایا جا رہا ہے تو اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ یہ تخریب ہے۔ اگر قاعدے اور قانون کے مطابق یہ کچھ ہو رہا ہے تو اس بیج کا پھٹ جانا، اس مکان کا ڈھایا جانا تخریب ہے جو ایک تعمیر کے لیے ہو رہی ہے۔ ''فلق'' کہتے ہیں: اس ''قسم کا کسی چیز کو پھاڑنا کہ اس میں سے ایک نئی زندگی نکل آئے''۔ یہاں کہا ہے کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ [1] (113:1) فوراً اس نشوونما دینے والے کے قوانین محکم کی پناہ میں آ جاؤ کہ جس کے ہاں جسے بظاہر تخریب کہا جاتا ہے، وہ ایک نئی تعمیر کے لیے ہوتی ہے۔ یہ جو تم نے ان سلطنتوں کو، ان تہذیبوں کو، گرایا ہے تو اس سے ان کے دل میں جذبہ انتقام آ رہا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے ہاں آ کر Destruction (تخریب) کی ہے۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ یہ تخریب تو ایک نئی تعمیر کے لیے ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ تعمیر کیا سے کیا بنا دے گی۔ یہ ہے وہ خدا جس کی پناہ میں آؤ، جس کی حفاظت میں آؤ، جس کی تخریب کے اندر بھی تعمیر مضمر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کن کن چیزوں سے، خدا کی پناہ اور حفاظت میں آؤ؟ برادران عزیز! اب عجیب چیزیں آ رہی ہیں۔

---

[1] (یہ انقلاب جس نئے مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ یعنی جس مرحلہ میں اب مخالف قوتوں سے تصادم ہوگا، اس میں تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح محتاط رہنے کی جس طرح ایک نوزائیدہ بچے کو ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ ساتھ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا تم اپنی جماعت سے کہہ دو کہ میں اپنے نشوونما دینے والے کے اُس نظامِ ربوبیت کے آغوشِ حفاظت میں پناہ لیتا ہوں جس کا قانون تخلیق وارتقاء یہ ہے کہ تخریبی اور تعمیری قوتوں کے تصادم سے، ایک نئی چیز کی نمود ہوتی ہے۔ دانہ پھٹتا ہے تو اس میں سے کونپل نکلتی ہے۔ (6:96)

لفظ خیر اور شر کی حقیقت

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ آخری درس ہے۔ آج مجھے آپ وقت کی پابندی سے اجازت دے دیجیے۔ کیا پتہ پھر یہ وقت آئے یا نہ آئے! یہ آخری سورتیں ہیں، مجھے تفصیل سے بیان کر لینے دیجیے۔ عزیزانِ من! ابھی یہ سوال اٹھایا تھا کہ کن کن چیزوں سے حفاظت میں آنا چاہیے؟ اس حفاظت کے لیے کہا کہ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ [1] (113:1) اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ایک ''شر'' ہے اور دوسرا ''خلق'' ہے۔ فلسفہ کا طالبعلم جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ذہن انسانی کو جس نے پیچ و تاب میں رکھا ہے، وہ خیر اور شر کا مسئلہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ Good&Evil (خیر و شر) کیا ہوتے ہیں؟ یہ ایک جو Evil (شر) بتایا جاتا ہے اور دوسرا (خیر) Good یہ بہت پرانا الجھا ہوا سوال ہے۔ فلسفے میں یہ ہے کہ اگر دنیا میں شر یا Evil خدا کی مرضی کے مطابق ہو تو خدا خیر نہیں ہو سکتا اور اگر اس کی مرضی کے خلاف موجود ہو تو وہ قادرِ مطلق نہیں ہو سکتا کہ اسے مٹا نہیں سکتا۔ آپ اس پہ حیران ہونگے اور میں سمجھتا ہوں کہ فلسفے کے طالبعلم اسے جانتے ہیں۔ الماریوں کی الماریاں، کوٹھوں کے کوٹھے اُن کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں جو کہ اس پر لکھا گیا ہے۔ دو الفاظ میں قرآن نے سارا مسئلہ حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (113:2) جو کچھ تخلیق خداوندی ہے، وہ Physically (طبعی طور پر) اپنی ذات کے اندر، نہ خیر ہے، نہ شر ہے۔ ان کا استعمال اُسے شر اور خیر بنا دیتا ہے۔ مثلاً زہر کے دو قطرے مرنے والے میں نئی زندگی پیدا کر دیتے ہیں، اسی کے پچاس قطرے زندگی کو ختم کر دیتے ہیں۔ پانی جیسی مدِ حیات چیز کے ایک دو گلاس پیچے تو آپ کو زندگی دیتے ہیں، اسی پانی میں آدمی ڈوب کر مر جاتا ہے۔ حرارت پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے لیکن جس دن یہ 98.6 درجے فارن ہائیٹ (Fahrenheit) سے اوپر پہنچ جاتی ہے، اس دن بخار چڑھ جاتا ہے۔ صبح سے شام تک ہم آگ (Fire) سے اتنے عجیب و غریب کام لیتے ہیں لیکن اسی آگ میں جب انگلی پڑ جائے تو وہ اس کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ آگ، سنکھیا، پانی اپنی ذات میں نہ خیر ہیں، نہ شر ہیں۔ انہیں جس طرح آپ استعمال کرتے ہیں، اس کے مطابق ان کا نتیجہ خیر اور شر ہوتا ہے۔

یہاں کیا ہے کہ مَنْ شَرِّ مَاخَلَقَ [1] (113:2) جو کچھ تو نے کائنات میں پیدا کیا ہے، ہمیں اس سے بچا کہ ہم اسے اس طرح

---

[1] خدا نے کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اسے اس کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق صرف میں لایا جائے تو وہ خیر ہی خیر ہے لیکن اگر اس کا استعمال غلط طریق سے کیا جائے تو اس سے شر پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس طرح کے شر سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ یعنی اس احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہ کائناتی قوتوں کا استعمال غلط (وحی کے خلاف) طریق سے نہ ہونے پائے۔ (1-2 مفہوم القرآن۔ پرویز)

استعمال کریں کہ اس کا نتیجہ شر پیدا ہو جائے۔ اب سلطنت ملی ہے' حکومت ملی ہے' دولت کی فراوانیاں آئی ہیں۔ یہ سب کچھ آیا ہے۔ یہ چیزیں انسانی زندگی' تمدن اور تہذیب کے لیے بڑی ضروری ہیں لیکن یہی تو وہ پانی ہے جہاں آ کر امتیں ڈوبتی ہیں۔ یہ سب کچھ ملنے کے بعد یہ کہا کہ اب ہمیں اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم انہیں اس طرح استعمال کریں کہ اِن سے شر کا پہلو پیدا ہو جائے۔ اور یہ بات بڑی آسان ہے۔ خدا کے قوانین کے مطابق انہیں استعمال کیجیے تو خیر ہی خیر ہے۔ اِن کی خلاف ورزی کر کے استعمال کیجیے تو ہر شے شر ہے۔ تو یہ جو ''تعوذ'' ہے یہ اس کے شر کے پہلو سے حفاظت میں رکھنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے یا حاصل ہو' اسے تیرے قانون کے مطابق صرف کریں تا کہ ''خیر'' ہی کا پہلو ہمارے سامنے آئے۔ تو وہ ''تعوذ'' کس چیز سے چاہتا ہے؟ اشیاء کائنات کے استعمال کے غلط طریقے سے' کہ جس کا نتیجہ شر پیدا ہو جائے۔

برادران عزیز! آپ دیکھتے ہیں کہ کیا کیا حفاظتی تدابیر ہیں۔ جہاں کہیں تمہیں کوئی چیز ڈھانی پڑے تو اس لیے ڈھاؤ کہ اس سے بہتر تعمیر کر سکو۔ جو کچھ حاصل ہو' اسے اس طرح استعمال کرو کہ خدا کے قانون کے مطابق نتائج ''خیر'' برآمد ہوں۔ یہ تو یوں ہوا کہ جو کچھ حاصل ہوا ہے' افراط کی طرف جا کر اس کی فراوانیاں تمہیں غرق نہ کر دیں جیسے اگر پانی زیادہ پی لیا جائے تو آدمی مر جاتا ہے' ان اشیاء کا نہ ہونا۔ یہ بھی انسان کے لیے تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ جہاں پانی کی فراوانی سے آدمی مر جاتا ہے' وہاں پانی نہ ہونے سے بھی مر جاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس طرح کے شر (Evil) سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے یعنی اس احتیاط کی سخت ضرورت ہے کہ کائناتی قوتوں (Cosmic Froces) کا استعمال غلط (وحی کے خلاف) طریق سے نہ ہونے پائے۔

شر کا دوسرا پہلو محتاجی ہے

اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا کہ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (113:3) اور ہمیں ان چیزوں کے متعلق بھی خاص احتیاط برتنے کی ضرورت ہے جن کے نہ ہونے سے نشوونما رک جاتی ہے۔ یہ شر (Evil) کا دوسرا پہلو ہے۔

عزیزان من! غور کیجیے کہ قرآن کہاں لے جاتا ہے! اگر یہ استعمال' اشیاء کی فراوانی کی طرف لے جاتا ہے تو کہا کہ وہاں بھی شر کا یہ پہلو ہوتا ہے۔ دوسری طرف وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ (113:3) اگر یہ استعمال' ان شیاء کی طرف لے جاتا ہے جن کے نہ ہونے سے نشوونما رک جاتی ہے تو اس میں بھی شر کا پہلو ہے۔ آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو جاتی ہے جب وہ چیزیں نہ ہوں جن پر انسان کی نشوونما کا دارومدار ہے۔ ادھر افراط کے ساتھ ہونا ''شر'' تھا' اِدھر ان کا معدوم ہونا ''شر'' ہے' ان کا غائب ہو جانا شر ہے۔ کہا کہ دوسری طرف یہ کیفیت بھی نہ پیدا ہو جائے۔ سامانِ نشوونما کے محروم ہو جانے سے انسان کی آنکھوں کے سامنے جو اندھیرا چھا جاتا ہے'

وہ شر ہے۔ اس لیے وہ شر بھی کہیں نہ آنے پائے۔

دولت کی فراوانی سے بھی انسان بدمستیوں کا شکار ہو جاتا ہے

دولت کی افراط ہو تو اس سے بدمستیاں پیدا ہوں اور محتاجی ہو تو اس سے دنیا اندھیر ہو جائے۔ دیکھنا' کہیں یہ دونوں ہی نہ ہو جائیں۔ ہمارے پہلے دَور کے اندر تباہی فراوانی کی وجہ سے آئی۔ اور اس کے بعد اگلے دَور میں ہماری ساری تباہی اس چیز سے آئی کہ ہم سامانِ نشوونما سے بھی محتاج ہو گئے۔ غور کرتے جایئے گا کہ جن جن چیزوں کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ ان کے لیے Precautionary Measures (احتیاطی تدابیر) لینا' ان کے لیے محتاط رہنا' ہم نے انہیں ایک ایک کر کے چھوڑ دیا۔

جہالت میں منافقین کا کردار

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے تو پہلے سے وارن (Warn) کر دیا تھا کہ کہیں ایسے نہ کر دینا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ (113:4) یاد رکھو! اس قسم کے منافق جماعتوں کے اندر آ جایا کرتے ہیں کہ جونہی تم نے کسی محکم چیز کا ارادہ کیا' فیصلہ کیا کہ یہ کرنا ہے تو وہ آ کر کسی نہ کسی طرح سے ایک پھونک مارتے ہیں کہ تمہارا وہ ارادہ متزلزل ہو جائے۔ یہ باہر والے نہیں ہوتے' یہ اندر والے ہوتے ہیں۔ تمہارے عوام کی جو محکم گرہیں ہیں' انہیں ڈھیلا کرنے کے لیے ایسی جماعتیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گی جو اس قسم کی پھونک ماریں گی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ خفیہ سازشوں کے لیے یہ کیا چیز کہی گئی ہے کہ بس ایک پھونک مارنے والا ہے کہ پروپیگنڈہ کی مہم شروع ہے تا کہ اس کے نفسیاتی اثرات سے تمہارے پختہ ارادوں میں کمزوری پیدا ہو جائے' ہمتیں پست ہو جائیں' دلوں میں ایسے شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں جن سے یقین محکم میں تزلزل واقع ہو جائے۔ تمہیں ایسی جماعتوں اور ان کی اس قسم کی حرکات سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب عزم صمیم میں ہی شک وشبہ پیدا ہو جائے یا اس میں کمزوری واقع ہو جائے تو اس کے بعد تو آپ ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکتے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کے جو لوگ جماعت کے اندر ہیں' ان سے محتاط رہنا۔

حسد کا مفہوم اور اس کی تباہ کاریوں کے اثرات

دوسری بات یہ کہی کہ جماعت کے باہر والی قوتوں کی ایک اور چیز بھی ہوا کرتی ہے' اس سے بھی محتاط رہنا۔ اس کے لیے کہا کہ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (113:5)۔ یہ حسد عجیب چیز ہے۔ حسد یہ ہوتا ہے کہ درختوں کی کسی ٹہنی کو اس طرح سے چھیل دینا کہ وہ

چھلکا اس کے کام کا نہ رہے جو کچھ کسی کے پاس ہے وہ مجھے ملے یا نہ ملے لیکن اس کے پاس نہ رہے۔ یہ ہے حسد۔ رشک تو یہ ہوتا ہے کہ جو اس کے پاس ہے وہ مجھے بھی ملے۔ اور حسد یہ ہوتا ہے کہ مجھے بیشک نہ ملے لیکن اس کے پاس نہ رہے۔

برادران عزیز! امت مسلمہ پہ جو سب سے بڑی تباہی آئی ہے وہ اس حسد سے آئی ہے۔ تفصیل میں جاؤ نگا تو مجھے لمبی تاریخ سے گزرنا پڑے گا۔ وہ قومیں جو شباشب اسلام لے آئی تھیں، جن کی تہذیبوں کو، جن کے تمدنوں کو، جن کی حکومتوں کو، آپ نے تباہ کیا تھا، باطل کی تھیں۔ ان کے دل میں آپ کے خلاف انتقام کا جذبہ تھا۔ وہ مسلمان تو ہو گئے لیکن اس کے بعد انہوں نے یہ سوچا کہ وہ اس نظام یا اسلام یہ ایمان نہیں لائیں گے، اس لیے کچھ ایسا کریں کہ آپ کے پاس بھی وہ کچھ نہ رہے جس کے بل بوتے پر آپ اس عروج تک پہنچے۔ آپ کا یہ موجودہ اسلام اس طرح سے بنا تھا۔ یہ ہے حسد کا وہ جذبہ جس نے آپ کو تباہ کیا تھا کہ ان کو چھیل کے رکھ دو۔ انہیں پتہ تھا کہ جس چیز نے انہیں ہمارے اوپر غالب کیا ہے وہ ان کا یہ قرآنی نظام ہے کہ انہوں نے رشک نہیں کیا تھا کہ جیسا نظام ان کا ہے، ہم بھی اس کو اپنالیں۔ ان میں جذبہء انتقام تھا۔ انہوں نے میدانِ جنگ میں جو شکست کھائی تھی دین کے میدان میں آ کر انہوں نے اسِ طرح ہمیں شکست دی کہ جس چیز کی بنا پہ ہم ان پر غالب آئے تھے، انہوں نے وہ چیز ہمارے پاس نہ رہنے دی۔ آپ سے قرآن چھڑا دیا۔ خود اس قرآن کو اپنایا نہیں، آپ کے پاس رہنے نہیں دیا۔ دیکھا ایک لفظ حسد نے کہاں تک بات پہنچادی۔ دین اسلام کو اس طرح چھیل دیا کہ کسی کام کا نہیں رہا، خود تو انہوں نے لینا ہی نہیں تھا۔ یہ کیا کہ آپ کے پاس بھی اصل حالت میں نہ رہے۔

کہا کہ اگر احتیاطی تدابیر نہ لیں تو یہ کچھ ہوگا اس لیے بہت محتاط رہنا۔ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو تمہاری کامیابیوں سے جل بھن جائیں گے اور تم سے حسد کرنے لگیں گے۔ تمہیں ان حاسدوں سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جب یہ چیزیں آئیں تو اس کے لیے ایک ہی علاج ہے کہ فوراً بھاگ کر قانونِ خداوندی کے قلعہ کے اندر، اس حفاظت کے اندر، آ جاؤ۔ ان قوانین کی زیادہ سے زیادہ اطاعت کیا کرو۔ یہ ہے طریقہ ان تمام تخریبی قوتوں سے بچنے کا۔ نظام تم نے قائم کیا ہے۔ یہ اسی صورت میں رہ سکے گا کہ تم یہ کچھ کرو۔ یہ ہیں وہ تخریبی قوتیں جن سے تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی اور اس کی شکل یہ ہوگی کہ تم زیادہ سے زیادہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرو اور اس طرح اس کی حفاظت کے آغوش میں آ جاؤ۔ اس کے ساتھ دوسری حفاظتی تدابیر بھی بتائیں، جو اگلی سورۃ میں ہیں۔ یہاں سورہ الفلق ختم ہوتی ہے۔

اب ہم سورۃ الناس لیتے ہیں۔

سورۃ الناس (آیات 1 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرانِ عزیز! اب سورۃ الناس لیتے ہیں۔ یہ 114 ویں سورۃ ہے اور اس کی پہلی تین آیات یہ ہیں:

نوعِ غلامی کے وہ تین شعبے جنہوں نے پوری انسانیت کو اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِکِ النَّاسِ o اِلٰـہِ النَّاسِ (114:1-2-3)۔ سارے قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ ان آیات کے اندر ہے' سارا نظام اِن کے اندر ہے۔ وہ کونسے تین گوشے ہیں جہاں انسانیت کو Exploit (سلب ونہب) کیا جاتا ہے؟ روٹی کا گوشہ ہے' جسے اکنامکس سسٹم کہتے ہیں۔ جونہی وہ انسانوں کے ہاتھوں میں آیا' دوسرے انسانوں پر دنیا تنگ ہوگئی۔ اب جو جی چاہے ان سے کرا لیجیے۔ محتاج ہی تو غلام ہوتا ہے۔ یہ پہلا مسئلہ روٹی کا ہے۔ دوسرا مسئلہ سیاسی اقتدار کا ہے۔ سیاسی اقتدار ہاتھ میں لے لیجیے پھر قانون کے زور پہ نچوائیے۔ اور تیسری چیز مذہبی ورحانیت کا مسئلہ ہے۔ عوام کو اس کے فریب میں پھنسا دیجیے اور اس کے بعد جو جی میں آئے ان سے کرائیے۔ یہ کم بخت پہلے دو سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مذہبی اور روحانیت کی غلامی کی یہ زنجیریں انسان کے قلب ودماغ پر مسلط ہوتی ہیں۔ غلام تو رسی تڑا کر بھاگنا چاہتا ہے مگر ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ اگر حضرت صاحب کی نگاہ بدل جائے تو گڑ گڑاتا ہے' روتا ہے' معافی مانگتا ہے: ''حضور مجھے راندۂ درگاہ نہ کر دیجیے۔'' یہ اتنی محکم زنجیریں ہیں۔

برادارانِ عزیز! زنجیروں کے تین ہی گوشے ہیں۔ روٹی کے مسئلے میں کسی کو محتاج کر کے رب بن جاؤ' سیاسی اقتدار حاصل کر کے مالک بن جاؤ اور روحانی اقتدار حاصل کر کے الہ بن جاؤ۔ کہا کہ یہ تینوں کے تینوں باطل ہیں۔ دنیا میں کوئی اور رَبِّ النَّاسِ o مَلِکِ النَّاسِ o اِلٰـہِ النَّاسِ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کریم کی ساری تعلیم ان میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ قرآن یہی کچھ کہتا چلا آ رہا تھا' پھر الناس کہہ کر اس کو محیطِ کل بنا دیا۔ میرا تیرا اس کا یا اس قوم کا اِلٰـہ نہیں بلکہ کہا کہ پوری انسانیت کا ہے۔ اور پوری انسانیت کو ہر قسم کی نوعِ غلامی سے رہائی دلا دی۔ یہ قرآن کی تین آیتیں ہیں۔ آیتیں بھی کیا ہیں' صفاتِ خداوندی ہیں۔ ہر قسم کی غلامی سے نوعِ انسانیت کو چھڑا دیا: رَبِّ النَّاسِ o مَلِکِ النَّاسِ o اِلٰـہِ النَّاسِ ۔ روٹی' سیاسی اقتدار اور روحانیت کی الوہیت کی جتنی بھی قوتیں ہیں' قرآن کریم نے ان سب کی نس کاٹ کے رکھ دی۔ یہ قوم پیدا کی تھی' یہ نظام پیدا کیا تھا۔ یہ پہلی ''خیر'' ہے۔ اس لیے کہا تھا کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِکِ النَّاسِ o اِلٰـہِ النَّاسِ (114:1-3) اس مقصد کے لیے جس کا ذکر سابقہ سورۃ (الفلق) میں کیا گیا ہے تمہیں اس

خدا کے قانون سے اور زیادہ قریب ہو جانا چاہیے جس کے پیش نظر کسی خاص گروہ، قبیلہ، جماعت یا قوم کی نہیں بلکہ پوری کی پوری انسانیت کی نشوونما ہے۔ وہ رَبِّ النَّاسِ (1:1) ہے۔ یعنی اس خدا کے قانون سے قریب تر جس کے سوا، کسی کو حق حاصل نہیں کہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ ساری کائنات میں غلبہ واقتدار اسی کا ہے اور اسی کے قوانین کی محکومیت انسان کو اختیار کرنی چاہیے۔ وہ ملک الناس ہے۔ اور وہی ہے جس کا قانون حفاظت تمام نوع انسان کو پناہ دے سکتا ہے۔ اسی سے انسانیت تمام خطرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ وہ الہ الناس ہے۔ اس خدا کے قوانین کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متمسک رہ کر ہمیں ایک اور چیز سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

نصابِ تعلیم کے ذریعہ وسوسہ کے خطرناک جراثیم کی گرفت

یہ ایک اور بھی اہم پہلو ہے کہ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (114:4)۔ اس آیت میں وسواس کا لفظ آیا ہے اسی سے لفظ وسوسہ ہے۔ وسوسہ یہ ہوتا ہے: ''دبے پاؤں اس طرح سے کسی کا آنا کہ آہٹ نہ ہونے پائے۔ جیسے شکاری شکار کی تلاش میں جاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ آہٹ نہ آنے پائے''۔ اس کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں کہا کہ اس قسم کی قوتیں آئیں گی کہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہوگا، ان کی آہٹ تک بھی تم نہیں پاسکو گے۔ یہ کیا کریں گی؟ یونہی ایک ذرا سی بات کان میں ڈالی۔ اور ''خناس'' ہو گئیں۔ ''خناس'' کے معنی ہوتا ہے: ''چپکے سے دبے پاؤں واپس چل کر پوشیدہ ہو جانا۔'' وہ قوتیں خواہ وہ آپ کی نفسیاتی قوتیں (Psychological Forces) ہیں، سیاسی سازشوں کی قوتیں (Forces of political conspiracies) ہیں، روحانی دنیا کی اس قسم کی قوتیں، وہ تمام شکاریوں کی طرح اس احتیاط سے آتے ہیں کہ کہیں کھڑکا نہ ہونے پائے، ورنہ شکار تو بدک جاتا ہے۔ یہ کھٹکا ہونے ہی نہیں دیتے۔ اور کرتے یہ ہیں کہ کوئی چیز ذرا اسی کان میں پھونکی اور اس کے بعد یوں واپس چلے جاتے ہیں۔ واپس جانے کے بعد چھپ جائیں کہ پتہ نہ چلے۔ کہا کہ ان قوتوں سے اپنے آپ کو حفاظت میں رکھو۔

آگے کہا کہ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ (114:5)۔ جو یہ غلط قسم کی تعلیم ہے، یہ ہے وہ جس کی طرف وساوس کی یہ چیز آگئی: آہٹ نہ ہونے پائے، شکاری ہو، Exploit (سلب ونہب) کرنا چاہے، پتہ نہ چلے اور دلوں [1] کے اندر ایک چیز اتارتا چلا جائے۔ کسی قوم کا نصابِ تعلیم بدل دیجیے تو قوم کی قوم بدل جاتی ہے۔ یہ وہ وساوس ہیں، جو صدور الناس کے اندر، اس طرح اتارے جاتے ہیں کہ شکار کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ مجھے اس نے پکڑ لیا ہے۔ وہ اس کی حمد وستائش میں قصیدے پڑھتا ہے۔ انہوں نے ایسا انتظام

---

[1] قلوب واذہان

کر رکھا ہے۔ وہ قلوب کے اندر یہ چیزیں اتارتے چلے جاتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاں کی ساری تعلیم جو مذہبی مدارس میں ہو رہی ہے' یہ ساری کی ساری آپ کو قرآن سے بیگانہ کرنے کے لیے ہے۔ اُدھر جتنی تعلیم آپ کو مغرب کی طرف سے آ رہی ہے وہ ساری شرفِ انسانیت سے بیگانہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ ہے جو صدور الناس کے اندر وساوس ڈالے جاتے ہیں کہ پتہ نہ چلے کہ کس وقت کیا چپکے ہی چپکے کانوں میں کچھ پھونک کر پچھلے پاؤں لوٹ گئے اور دلوں میں وساوس پیدا کر کے عزمِ راسخ کو کمزور کر گئے۔ [1] کون ہیں جو یہ کچھ کرتے ہیں؟ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (114:6) اپنے ہوں یا Foreigners (اجنبی) ہوں یہ دونوں کریں گے۔ خود اپنے ہو کے بھی یہ کچھ کریں گے کہ جن سے مانوس ہوتے ہو' یہ بھی کریں گے' جن سے تم مانوس نہیں ہوتے ہو' وہ باہر کے رہنے والے ہوتے ہیں وہ بھی یہی کریں گے۔

برادران عزیز! ہمارے ساتھ تو ہوا ہی یہی ہے۔ اس قسم کی غلط تعلیم دی کہ جس نے ہماری امت' ہماری ملت' قوم کے نوجوانوں کے سینوں کو ان وساوس سے اس بری طرح سے بھر دیا ہوا ہے کہ ان بیچاروں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہمیں کہاں لیے چلے جا رہے ہیں۔ غیروں نے بھی یہ کیا اور اپنوں نے بھی یہ کیا۔ آپ کی ہزار سال کی ساری تاریخ اسی چیز کا رونا رونے کی بات ہے۔ تو کہا کہ یاد رکھو کہ یہ چیزیں تمہیں تباہ کریں گی۔

عزیزان من! سن لیجیے۔ سورۃ الناس قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے جو آج بحمدہ تعالیٰ ختم ہو گئی۔ وہ سلسلہ دراز جو آج سے سات سال پہلے مسلسل شروع کیا تھا' سات سال کے بعد اللہ کی توفیق سے آپ حضرات کے انتظام سے اور اس کے سننے سے آج اختتام کو پہنچا۔ میرے ذہن میں تھا کہ درس کی تکمیل کے بعد اس درس کے متعلق کچھ باتیں آپ حضرات سے کروں لیکن چونکہ آپ حضرات نے یہ طے کیا ہے کہ اس درس کی تکمیل کی تقریب آئندہ اتوار کو منائی جائے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ جو کچھ میں نے آج اس درس کے خاتمے پر آپ احباب کی خدمت میں گزارش کرنا تھا' اسے اس تقریب میں اپنے خطاب کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ یہ چیزیں تو میں آئندہ اتوار کو پیش کرونگا۔

---

[1]

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ' اور وہ ضمیر کی موت

لیکن ان حالات میں بھی اقبال مایوس نہیں لہٰذا اس کا کہنا یہ ہے کہ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

رب العزت کی بارگاہ میں دل سے نکلنے والی دعا

اب آیئے ہم اس سلسلہ زریں کی تکمیل پر اپنی دلی آرزوؤں کو قرآن کریم کے الفاظ میں دعا کی شکل میں بحضور رب العزت یہ کہتے ہوئے پیش کریں کہ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْلَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ❶ [286:2] رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ❷ [8:3] رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ❸ [126:7] رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ ❹ [10:59] رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ❺ [127:2].

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

☆☆☆

---

❶ بارِالٰہا! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے' یا نشانہ خطا ہو جائے' تو یہ چیز ہماری نشوونما کے راستے میں حائل نہ ہو۔ ہم پر ایسی ذمہ داریاں عائد نہ ہوں جن کے ہم متحمل نہ ہو سکیں (یعنی ہمیں ہر ذمہ داری کے مناسب قوت حاصل رہے)۔ اگر ہم سے کہیں لغزش ہو جائے تو ہمیں اس کی توفیق ہو کہ ہم' اپنے حسن عمل سے اس کے مضر اثرات کو مٹا سکیں' ہم تمام تخریبی عناصر کے حملوں سے محفوظ رہیں۔ ہماری نشوونما کے لیے ضروری سامان وذرائع' تیرے قانون ربوبیت کے مطابق' ملتے رہیں اس لیے کہ تیرا قانون ربوبیت ہی ہمارا سرپرست اور کارساز ہے۔ اور اسی کی تائید ونصرت سے ہم حق کے مخالفین پر غلبہ اور کامیابی چاہتے ہیں۔ بارِالٰہا! ہماری ان آرزوؤں کو شرف تکمیل عطا فرما!

❷ بارِالٰہا! ہمارے قلوب (قرآن کی صحیح) راہنمائی کے بعد کسی اور طرف نہ جھک جائیں اور ہماری قلبی اور ذہنی صلاحیتیں اسی کی روشنی میں برومند ہوں اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان کو اس کی صحیح منزل کی طرف راہنمائی تنہا عقل کی رو سے نہیں مل سکتی۔ یہ صرف وحی کی رو سے ممکن ہے جو خدا کی طرف سے (حضرات انبیائے کرام کو) وہبی طور پر ملتی تھی' کسب وہنر سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

❸ بارِالٰہا! ہمارے دلوں کو صبر واستقامت سے لبریز کر دے اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے احکام کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔

❹ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمارے لیے بھی سامانِ حفاظت عطا فرما دے اور ہمارے ان بھائیوں کے لیے بھی جو ایمان میں ہم پر سبقت لے گئے ہیں اور ہمارے دل میں کسی مومن کے لیے ذرہ بھر کدورت پیدا ہونے نہ دے۔ تو سب کے لیے حالات میں نرمی پیدا کرنے والا اور سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے۔

❺ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما' کہ تو دل میں مچلنے والی ارزوؤں کو جانتا ہے اور لب تک آنے والی تمناؤں کو سنتا ہے' اس لیے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت اس مرکز کی تعمیر کے لیے کوشاں ہیں۔ (1-2-3-4-5 مفہوم القرآن۔ پرویز)

☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سید مجاہد حسین

حدود آرڈیننس.....قرآن کریم کیا رہنمائی کرتا ہے؟

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآن کو بنا دیتے ہیں پاژند

(اقبال)

جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس کے قوانین کا نفاذ کیا۔ اس کے بعد کے ادوار حکومت میں یہ قوانین جوں کے توں نافذ رہے۔ موجودہ حکومت نے ان قوانین میں تبدیلیاں لانے کے لئے تحفظ خواتین کا بل اسمبلی میں پیش کیا۔ جس کی ہمارے مذہبی طبقے کی طرف سے شدید مخالفت اور مذمت کی گئی۔ ان کا موقف ہے کہ ضیاء صاحب کے نافذ کردہ یہ قوانین عین حدود اللہ ہیں اور ظاہر ہے حدود اللہ میں تغیر و تبدل کا حق کسی انسان کو نہیں ہے جبکہ حکومت کا یہ موقف ہے کہ یہ نافذ شدہ قوانین اللہ کے نہیں بلکہ انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کی بنیاد پر آج تک کسی ایک مجرم کو بھی سزا نہیں دی جا سکی' اس لئے ان میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ کے فرزند جسٹس (ر) جاوید اقبال نے اپنی تصنیف ''اپنا گریباں چاک'' میں ضیاء صاحب کے نافذ کردہ ان قوانین پر شدید تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان قوانین میں ''ثبوت کے مشکل معیار'' کی وجہ سے مجرم کو پکڑنا ممکن ہی نہیں' لہٰذا ان قوانین کو فی الفور تبدیل کیا جائے۔ میرے ایک دوست نے بتایا کہ جسٹس صاحب کی اہلیہ محترمہ ناصرہ جاوید کے ایک بیان کے مطابق حدود آرڈیننس کے نافذ ہونے سے پہلے صرف ۳۰۰ خواتین ایسے جرائم میں پاکستان کی جیلوں میں بند تھیں اور ان کے نفاذ کے بعد صرف ۶ ماہ کے اندر جیلوں میں خواتین کی تعداد ۵۰۰۰ تک جا پہنچی۔ حقائق و واقعات یہ بتاتے ہیں کہ جب کسی عورت کے ساتھ کوئی زیادتی کرتا تھا تو وہ بیچاری عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی لیکن جب وہ مطلوبہ ثبوت فراہم

نہ کر پاتی (جو کہ ناممکن تھا) اور چند ماہ بعد حمل ٹھہرنے کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہوتی تو اسی کو دلیل بنا کر حدود آرڈیننس کے تحت اُلٹا اسے جیل میں ڈال دیا جاتا۔ اس طرح شروع شروع میں ۸۵ فیصد ایسی مظلوم خواتین تھیں جن کو حدود آرڈیننس کے تحت جیل میں ڈالا گیا اور پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ ان ۲۷ سالوں میں حدود آرڈیننس کی وجہ سے کسی ایک مجرم کو بھی سزا نہیں مل سکی۔

ثبوت کا معیار: ہمارے علماء حضرات کا یہ موقف ہے کہ زنا بالجبر ہو یا بالرضا' جب تک چار عاقل مرد اس کی گواہی نہ دیں تو حد نافذ نہیں ہوسکتی (یعنی مجرم کو سزا نہیں مل سکتی)۔ یہ وہی معیارِ ثبوت ہے جس پر جاوید اقبال صاحب کڑی تنقید کرتے ہیں۔

حد اور تعزیر: یہاں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حد اور تعزیر کسے کہتے ہیں۔ جرائم کی جو سزائیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کر دی ہیں ان کو حدود اللہ کہا جاتا ہے۔ (کوئی اتھارٹی ان میں ردوبدل نہیں کر سکتی)۔ اور جن جرائم کی سزائیں اللہ تعالیٰ نے بیان نہیں کیں یا ایسے (نئے) جرائم جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے' ایسے تمام جرائم کو روکنے کے لئے وقت کے تقاضوں کے مطابق سٹیٹ خود ان کی سزاؤں کا تعین کرتی ہے' ایسی متعین کردہ سزاؤں کو تعزیرات کہا جاتا ہے۔ یہ دو بنیادی اصطلاحات ہیں جو حدود آرڈیننس کے ضمن میں آپ اکثر سنتے رہتے ہیں۔

یہ بات ایک عام گنوار اور جاہل آدمی بھی جانتا ہے کہ زنا بالجبر ہو یا زنا بالرضا کسی بھی جرم کو ثابت کرنے کے لئے ۴ گواہوں کا ملنا ناممکن ہے' جبکہ ہمارے علماء اس ثبوت پر بضد ہیں۔ (اور اصل میں اس پورے جھگڑے کے بنیاد ہی یہی ہے)۔ بالفرض محال اگر چار آدمی دیکھ بھی لیں کہ یہ جرم ہونے جا رہا ہے تو اس کو وہ فوراً روکیں گے یا ثبوت پیش کرنے کے لئے وہاں کھڑے تماشا دیکھتے رہیں گے؟ انہیں خطرات کی وجہ سے حکومت نے ان قوانین کو تبدیل کرتے ہوئے زنا بالجبر کو حدود سے نکال کر تعزیر میں ڈال دیا گیا۔ یعنی اب ایک مظلوم عورت کو چار گواہ تلاش کرنے کے ناممکن عمل سے نہیں گزرنا ہوگا بلکہ اس مقدمے کی سماعت بھی عام کیسوں کی طرح ہوگی۔ جس سے اس کو بھی انصاف ملنے کی توقع ہوگی۔ قانون میں اس تبدیلی پر سخت شور مچایا گیا اور اسے حدود اللہ میں تبدیلی قرار دیا گیا اور پھر جب حکومت نے کہا کہ زنا بالرضا کو تعزیر سے نکال کر حدود میں داخل کیا جائے گا تو بالآخر MMA کی زبان پر یہ بات آ ہی گئی کہ چار گواہ تلاش کرنا تو ناممکن ہے' اور نتیجتاً زنا بالرضا کی سرِ عام حوصلہ افزائی ہوگی۔

مگر میں پوچھتا ہوں ان محافظینِ دینِ متین سے کہ اگر یہ (ناممکن) شرط آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے لگائی ہے' تو کیا اس کو معلوم نہیں تھا اس طرح کوئی مجرم پکڑا ہی نہیں جائے گا؟ یا کیا خدا کی کتاب ناقص ہے (نعوذ باللہ)۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیسا اللہ کا قانون ہے جو پاکستان کی ۵۷ سالہ تاریخ میں ہزاروں مجرموں میں سے کسی ایک کو سزا نہیں دلوا سکا۔۔۔؟ نہیں نہیں یقیناً نہیں اللہ کا قانون ایسا ہو نہیں سکتا جو مظلوم کو رسوا کرے اور مجرم کی پشت پناہی کرے' اللہ کا قانون ایسا ہو ہی نہیں سکتا جس کا مغرب مذاق اڑا سکے۔ اب دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم اس باب میں ہماری کیا راہنمائی کرتا ہے' قرآن کریم جرمِ زنا پر حد نافذ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کی سزا میں کوئی نرمی نہ برتی جائے (سورہ نور' آیت ۲) کیونکہ یہ بڑی بے حیائی کا کام ہے (سورہ بنی اسرائیل' آیت ۳۲) وہ نہ صرف زنا کا جرم کرنے پر سزا دیتا ہے بلکہ زنا کی طرف لے جانے والے راستوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سورہ النساء کی آیت نمبر ۱۵ میں ارشاد ہے والتیٰ یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدو علیهن اربعة منکم۔ فان شهدو فامسکوهن فی البیوت حتیٰ یتوفهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا۔ (ترجمہ)۔ اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی فاشی کے کام کا ارتکاب کرے تو اس کی خلاف اپنے میں سے ۴ گواہ لاؤ اگر وہ گواہی دیں (اور جرم ثابت ہو جائے) تو ان کو گھروں میں بند کر دو تا آنکہ انہیں موت آ جائے یا اللہ ان کے لئے کوئی اور راہ نکال دے (یعنی یا ان کی شادی ہو جائے یا کچھ بھی جس سے عدالت کو بہر حال یقین ہو جائے کہ آئندہ یہ جرم نہ ہوگا)۔ قارئین کرام اس بیّن آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے نہ اٹھارہ علوم کی ضرورت ہے اور نہ ہی لمبی چوڑی تفاسیر کے مطالعہ کی اور یہی وہ واحد آیت مبارکہ ہے جسے ہمارے علماء حضرات چار گواہ یعنی زنا کے معیار ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔۔ لیکن قارئین کرام نوٹ کیجئے کہ ایک تو اس آیہ مبارکہ میں جس جرم کو ثابت کرنے کے لئے ۴ گواہ مانگے گئے ہیں' اس جرم کی سزا عورت کو گھر میں بند کر دینا تجویز کی گئی ہے اور دوسرا یہ کہ یہ حکم صرف عورت کے لئے آیا ہے۔ اب ظاہر ہے ایک تو زنا کی سزا گھر میں بند کرنا نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ زنا کی سزا تو مرد اور عورت دونوں کے لئے اکٹھی رکھی گئی ہے۔ پس ثبوت کا یہ معیار جرم زنا کے لئے نہیں (کیونکہ اس ثبوت کے تحت ملنے والی سزا زنا کی سزا نہیں ہے)۔ اس آیت کریمہ کا مطلب بالکل واضح ہو گیا کہ اگر کوئی عورت فاشی

پھیلا رہی ہے' جیسا کہ آج کون نہیں جانتا کہ مُجروں کے ذریعے فحش عورتیں کس قدر فحاشی پھیلا رہی ہیں' یا میڈیا پر بے ہودہ ڈانس ہوتا ہے یا کچھ بھی ایسا فحش کام جو زنا کی طرف لے جانے کا موجب ہو اس پر ۴ کیا ۴۰۰ گواہ لانا بھی کچھ مشکل نہیں! جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم تو زنا کی طرف لے جانے والے ہر راستے پر دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس نے صرف چار گواہ مانگے (تاکہ ایسے ہی کسی عورت پر کوئی الزام نہ لگا دے) اور حد نافذ کر دی۔ زنا کے ثبوت کے لئے قرآن نے گواہوں کی قطعاً کوئی قید نہیں لگائی۔ البتہ اگر کوئی شخص کسی عورت پر تہمت لگاتا ہے تو اس کے خلاف چار گواہ لانے پڑیں گے' اور اگر وہ پیش نہ کر سکا تو تہمت لگانے والے کو سزا ملے گی (سورہ نور' آیت ۴)۔ اس کو قذف کہتے ہیں۔ غور کیجئے قارئین کرام قرآن کریم کی ان واضح تعلیمات کے مطابق اگر اس مسئلہ پر قانون سازی کی جائے تو دنیا کا وہ کون سا قانون ہے جو عورت کو اس سے بہتر تحفظ دے سکتا ہے؟ اور فحاشی کو پھیلنے سے روک سکتا ہے؟ اور پھر حکومت کو زنا بالجبر کو ''حد'' سے نکالنے کی ضرورت رہے گی اور نہ زنا بالرضا کو تعزیر سے خارج کرنے سے فحاشی پھیلنے کا کوئی خطرہ رہے گا۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت نے (شائد نادانستہ) اور MMA نے دانستہ طور پر اس بنیادی نقطے پر توجہ دینے کی زحمت گوارا نہیں کی اور سیاسی اور مذہبی طور پر مسلمانوں اور اسلام کی جگ ہنسائی ہوئی اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ کہ صحافت' جس کا تعلق ہی اشاعت و تبلیغ سے ہے' کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے کسی کالم نگار یا تجزیہ نگار نے اس Root Cause پر قلم نہیں اٹھایا۔ اب آخر میں علامہ اقبالؒ کے چند اشعار ؎

خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

ایک آیۂ کریمہ کی وضاحت

حضورﷺ کے دور کے مشرکین جو حضور کی دعوت کی مخالفت میں اعتراضات اٹھاتے تھے ان میں ان کا ایک اعتراض خود نظام رسالت پر بھی تھا۔ وہ اس سلسلہ میں یہ اعتراض کرتے تھے کہ اللہ کو واسطہ یا نمائندہ بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ براہ راست خود ہم سے بات کیوں نہیں کرتا۔ وقال الذین لا یعلمون لولا یکلمنا اللہ او تاتینا آیۃ۔ کذالک قال الذین من قبلھم مثل قولھم تشابھت قلوبھم (۲/۱۱۸)۔ اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گذرے ہیں انہوں نے بھی انہی کی طرح بات کہی تھی۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہو گئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ حضور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ان سے ہم کلام ہوتا ہے، اگر ایسا ہے تو خدا نے ان کو ہی ہمارے میں سے کلام کرنے کے لئے کیوں منتخب کیا ہے۔ ہم جو قریش کے سردار و عمائدین ہیں خدا ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا۔ ان کے اس مطالبہ کی وضاحت کے بارے میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہر شخص اس مقام و مرتبہ کا اہل نہیں ہوا کرتا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون اس منصب کے لئے اہل ہے۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ (۶/۱۲۴)۔ اللہ ہی اس محل کو جانتا ہے جہاں وہ اپنی رسالت قرار دیتا ہے لیکن یہاں خاص اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا اور اس کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو اس بات کا احساس دلانا مقصود تھا کہ ان کا مطالبہ ہی نہایت غیر دانشمندانہ ہے اور اسکا جواب نہ دینا ہی ان کا جواب تھا۔

ہمارے نزدیک تو اس کی وجہ بالکل بدیہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو آزاد اور اپنے افعال و اعمال میں خود مختار پیدا کیا ہے۔ اگر ہر شخص کو براہ

راست وحی و ہدایت ملنے لگتی تو ہر شخص اس پر عمل کرنے کا مکلّف بھی ہوتا' پوری انسانیت میں اختیار و خود مختاری سلب ہو جاتی۔ آزادی و اختیار جو انسانیت کے لئے باعث شرف و مجد ہے انسانیت اس سے بالکل محروم و عاری ہو جاتی۔ کفار و مشرکین کے اس اعتراض کے بارے' دوسرے پیرائے میں' اللہ تعالیٰ نے انسان سے کلام کرنے کے طریقوں کی وضاحت میں سورہ شوریٰ میں فرما دیا اور سورۃ شوریٰ کی اسی آیت کی وضاحت اس مضمون کا عنوان ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه مایشاء۔ انه علی حکیم (۴۲/۵۱)۔ (ترجمہ) کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے' یا بھیجے کسی فرشتہ کو پس وہ وحی کرے اس کے اذن سے جو وہ چاہے۔ وہ عالی مقام اور حکمت والا ہے۔

مشرکین کا یہ اعتراض جو قرآن کریم میں کئی جگہ پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ان سے براہ راست کلام کیوں نہیں کرتا' اسی آیۂ کریمہ میں اس کا بیان ہے۔

یوں تو قرآن کریم کی سب آیات بے مثل و اہم ہیں لیکن بعض آیات وہ ہیں جن پر عقائد کی اساس ہوتی ہے اور وہ نہایت غور و تفحص کی متقاضی ہوتی ہیں۔ یہ آیہ کریمہ بھی ایسی ہی اہم آیت ہے لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین نے ایسی اہم آیت کی بالکل غلط تفسیر و توجیہ کی ہے جس سے ہمارے ہاں خارج از قرآن وحی کے تصور کی تائید ہوتی ہے اگر پہلے سے خارج از قرآن وحی کا تصور ذہن میں نہ ہو تو اس آیت کی تفسیر بالکل واضح ہے لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں تفاسیر جب لکھی گئیں اس وقت تک خارج از قرآن وحی کا عقیدہ وضع کر دیا گیا تھا۔ اسی عقیدہ کو پیش نگاہ رکھ کر' اس آیت کی تفسیر کی گئی جس سے ہمارے مفسرین کرام نے لغزش کھائی۔ البتہ ہمارا یہ دور خوش قسمت ہے کہ اس دور میں قرآنِ خالص سامنے آ رہا ہے۔ اسی لئے علماء قرآن نے تفسیر القرآن بالقرآن کے اسلوب پر اس آیت کی درست تفسیر فرمائی ہے۔ اب آپ کے پیش نظر اس آیت کی گذشتہ تفاسیر کا ملخص' اس کے اسقام' اور آیت کی درست تفسیر پیش کی جاتی ہے۔

واضح رہے کہ اس آیۂ کریمہ میں پوری

انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ملنے کے طریقے بتائے جا رہے ہیں۔ صرف انبیاء کرام کے لئے نہیں۔ ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کے سلسلہ میں جو تحریر فرمایا ہے وہ بہت طویل وثقیل ہے۔ ان کے لمبے لمبے اقتباسات کا مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کا ملخص نہایت احتیاط سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کا پورا مفہوم سامنے آجائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

(۱) (ان کے نزدیک) پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے رسول کے دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے اور رسول اس بات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ پردے کے پیچھے سے بات کرتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کا کلام اور اس کی آواز تو سنتا ہے لیکن اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ اس کی مثال حضرت موسیٰؑ سے خطاب ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ کے حکم سے جو چاہتا ہے رسول کے دل پر الہام کر دیتا ہے۔

سابقہ تمام مفسرین کرام نے بغیر کسی ایک استثناء کے، اس آیت کی تفسیر اسی مفہوم میں کی ہے اور وحی کے یہ تین طریقہ اس طور پر بتائے ہیں۔ گو مذکورہ بالا سطور میں ان کا ملخص پیش کر دیا گیا ہے تاہم اس کو مزید واضح اور آسان کرنے کی غرض سے راقم سطور اپنے الفاظ میں اسی مفہوم کو دوبارہ پیش خدمت کرتا ہے۔

(وہ فرماتے ہیں کہ) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان سے کلام کرنے کے تین طریقے بیان فرمائے ہیں، پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام کسی شخص پر بغیر واسطہ کے نازل کر دے۔ دوسرا طریقہ وحی کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الفاظ نازل نہ ہوں بلکہ وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔ اس کو آیت میں من وراء حجاب سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ طریقہ حضرت موسیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام فرشتہ پر نازل کرے اور وہ فرشتہ وہ کلام رسول تک پہنچا دے۔

اس آیۂ کریمہ کی اس طریح تفسیر کرنے سے مفسرین کرام نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ پہلی قسم کی وحی کو الہام والقاء قرار دے کر اسے ''حدیث'' کے مفہوم میں لے لیا ہے اور تیسری قسم کی وحی جو فرشتہ کی معرفت آتی تھی، اسے قرآن کریم سے تعبیر کیا ہے۔ اس طرح سے وحی خفی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ لیکن یہ تفسیر بوجوہ غلط

ہے۔

اس آیت میں وحی کرنے کا دوسرا طریقہ من وراء حجاب جو بیان کیا گیا ہے' اس میں اکثر مفسرین کرام کا یہی خیال ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے کیونکہ (۴/۱۶۳) میں متعدد انبیائے کرام کے متعلق فرمایا گیا کہ اللہ نے ان پر وحی کی' اور اس آیت میں حضرت موسیٰؑ کو ان سے الگ کر کے فرمایا گیا کہ وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً (۴/۱۶۴)۔ کہ اللہ نے موسیٰؑ سے بھی باتیں کیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تمام انبیاء کرام کی وحی سے الگ اور منفرد کر کے' ان کے کلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز فرمایا' ونادینہ من جانب الطور الایمن وقربنہ نجیا (۱۹/۵۲) اور ہم نے اسے کوہ طور کی دائیں جانب پکارا اور (وحی کی باتیں بتانے کے لئے) اپنے قریب کرلیا۔

اب غور طلب صرف دو صورتیں باقی رہ گئیں پہلی صورت کے لئے مفسرین کرام کا خیال ہے کہ یہ القاء یا الہام ہوتا تھا۔ اس طرح ایک فکر یا ایک بات دل میں ڈال دی جاتی تھی جس کو رسول اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ لیکن قرآن کریم اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن کریم کی رو سے وحی بمعنی الفاظ نازل ہوتی تھی فرمایا نزل بہ روح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین (۲۶/۱۹۵)۔ جسے روح الامین صاف عربی زبان میں لے کر تمہارے دل پر نازل ہوئے تاکہ تم بھی اور رسولوں کی طرح ڈراؤ۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ (۷۵/۱۶) (اے رسول) وحی کے جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو نیز فرمایا۔ فاذا قرانہ فاتبع قرانہ (۷۵/۱۸) جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اسی کو سنا کرو) اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔ اس آیت سے واضح ہے کہ صرف خیال دل میں نہیں ڈالا جاتا تھا بلکہ حضور کو کسی زبان میں وحی سنائی جاتی تھی اور پھر حضور اس وحی کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔ سورۃ الدخان میں ارشاد ہوتا ہے۔ فانما یسرنہ بلسانک لعلھم یذکرون (۴۴/۵۸)۔ تو ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ نیز آیت (۲۶/۱۹۶' ۴۴/۱۴) ملاحظہ ہوں۔ البتہ زمانۂ حاضرہ کی مشہور تفسیر ''تدبر قرآن'' نے ہمارے ہی موقف کی تائید کی ہے اور

تحریر فرمایا ''ہمارے نزدیک ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ وحی مجرد فکر کی شکل میں دل پر القاء ہوتی ہے جس کو الفاظ کا جامہ پیغمبر پہناتا ہے''۔ بڑی خوشی کا مقام ہے کہ ''تدبر قرآن'' نے سابقہ اہل روایات مفسرین کے برخلاف اہل قرآن مفسرین کے موقف کی تائید کی ہے۔

تیسری صورت وحی کی او یرسل رسولا فیوحیٰ باذنہ ما یشاء ہے۔اس میں ہمارے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنا فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ فرشتہ اللہ کے حکم کے مطابق رسول کے دل پر القاء کرتا تھا۔

دوسری صورت کو چھوڑ کر جس پر سب کو اتفاق ہے' پہلی اور تیسری صورت جو ہمارے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں وہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔جس کی یہ دو وجوہات ہیں۔

(۱) مفسرین کرام نے جو تفسیر کی ہے اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اس آیت کو صرف انبیاء کرام کو وحی ملنے کے طریقوں تک محدود کر لیا ہے۔ حالانکہ اس میں پوری انسانیت کو وحی ملنے کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اگر مفسرین کرام کی اس تفسیر کو درست خیال کر لیا جائے تو باقی انسانیت کو وحی کس طرح ملتی تھی؟ آیت کی تفسیر میں پوری نوع انسانی کو احاطہ میں لینا ہے کیونکہ آیت کے الفاظ وما کان لبشر ہیں۔اگر یہاں صرف انبیاء کا ذکر ہوتا تو وما کان لنبی آنا چاہئے تھا اور اس صورت میں یہ تفسیر درست ہوتی۔لیکن ما کان لبشر کے الفاظ کے ساتھ یہ تفسیر درست نہیں ہے۔ یہ بہت واضح اور بین سقم ہے۔جس کی وجہ سے یہ تفسیر درست نہیں ہوسکتی۔

(۲) مفسرین کی تفسیر کے مطابق دوسری قسم میں صرف آواز ماننا اور تیسری قسم میں جبرئیل کی معرفت وحی آنا تسلیم کیا جاتا ہے۔حالانکہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق تو قرآن صرف جبرئیل کے ذریعے آیا ہے فانہ نزلہ علی قلبک (۲/۹۷)' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی جب بھی آتی جبرئیل کے ذریعے آتی ہے۔اس کے لئے کوئی تیسری قسم جو وحیاء او من وراء حجاب سے الگ ہو' درست نہیں ہے۔

(۳) جب یہاں رسول کے معنی بخوبی لگ سکتے ہیں' تو فرشتہ معنی لینا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ جب کوئی لفظ اپنے اصلی معنے میں استعمال ہوسکتا ہے تو وہ ہی معنے اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے۔اس آیت میں رسول کے معنے

فرشتہ کرنے کے لئے دور دور کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اپنا ذاتی مفہوم لینے کے لئے کھینچ تان کرنا ہے۔ قریبی معنے چھوڑ کر بعید معنے لینا مناسب نہیں ہے۔

(۴) کلام الٰہی کی یہ تیسری قسم یعنی بذریعہ فرشتہ ارسال کرنا تو خود ہی وحیاً میں داخل ہے' اس کا الگ ذکر کرنا' بیکار ہے۔

سابقہ مفسرین کرام کی تفسیر میں یہ چار ایسے واضح نقائص ہیں جن کی وجہ سے یہ تفسیر درست تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ حالانکہ وہ سب اس تفسیر میں متفق ہیں۔ لیکن ان سب کا اس پر اتفاق کر لینا حجت نہیں ہے۔ اب اس کا درست مفہوم غور اور توجہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں پوری نوع انسانی تک اللہ کی ہدایت موصول ہونے کا ذکر ہو رہا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ تمام نوع انسانی' جیسا کہ آیت کریمہ سے ظاہر ہے فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین (۷/۶)' (پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف پیغمبر بھیجے گئے تھے سوال کریں گے اور خود پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے)۔ سورۃ شوریٰ کی مذکورہ آیت کے پہلے حصہ میں رسولوں کا ذکر ہے کہ ان تک خدا کی ہدایت کس طرح پہنچتی تھی۔

رسولوں کو ہدایت ملنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک وہ وحی جو جبرئیل لاتے تھے جیسا کہ حضور پر وحی آتی تھی یعنی جبرئیل کے ذریعے سے جس کی بابت ارشاد ہوتا ہے۔ فانہ نزلہ علیٰ قلبک (۲/۹۷)۔ دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست۔ اس طریقہ سے کہ آواز تو سنائی دے لیکن متکلم دکھائی نہ دے جیسا کہ حضرت موسیٰ کی طرف وحی ہوتی تھی اور جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے۔

یہ مذکورہ بالا دونوں طریقے انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھے۔

اب رہے وہ تمام لوگ جن پر تمام بنی نوع بشر مشتمل ہے اور جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ کلام خداوندی کا طریقہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول روانہ کرتا تھا اور اس رسول کی معرفت اپنا کلام عام انسانوں تک پہنچاتا تھا۔ یہ رسول ان کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تو رسول کے علاوہ کسی بھی بشر سے بات نہیں کرتا تھا اور وحی الٰہی یعنی ہدایت خداوندی انسانوں میں صرف انبیاء کرام کی طرف آتی تھی۔ رسولوں کے علاوہ عام انسانوں کو خدا کی وحی صرف انبیاء

کرام کی معرفت ملتی تھی۔

اس آیت کریمہ میں دو نکات مزید قابل غور ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ قرآن نے لبشر کا لفظ استعمال کر کے یہ واضح کر دیا کہ انبیاء کرام بھی بشر ہی ہوتے تھے ان کی کوئی الگ نوع یا جنس نہیں ہوتی تھی۔

(۲) دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے سوائے ان طریقوں کے۔ یعنی انسان خدا سے کلام نہیں کر سکتا' خدا انسان سے کلام کرتا تھا اور اس میں بہت فرق ہے۔ ہمارے ہاں جو لوگ تصوف کے زیر اثر یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ عبادت و ریاضت کے ذریعے انسان اپنی سعی و کوشش سے اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ سے کلام کر سکے اس آیت نے اس نظریہ کی جڑ کاٹ دی اور واضح کر دیا کہ کلام خداوندی سے مشرف و سربلند و سرفراز ہونے کے لئے انسان کو قطعاً کوئی اختیار و دخل نہیں' اس سے الہام' القاء' کشف و رویا' سب کی تردید ہو جاتی ہے اور یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک آیت سے تصوف کی ساری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ یہ آیہ کریمہ قرآن کریم کی مشکل آیات میں شمار ہوتی ہے اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے سخت غور کی متقاضی ہے۔ حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ اس کو عام فہم انداز میں اپنے قارئین کرام کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ وحی موصول ہونے کی دوسری صورت میں مفسرین کا زیادہ تر اتفاق ہے اور ہمارا بھی یہی موقف ہے۔ وحی موصول ہونے کی پہلی صورت کے متعلق جو مفسرین نے تحریر فرمایا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے اور ہمیں بھی اسی بناء پر اس سے اختلاف ہے۔ البتہ تفاسیر میں سے ''تدبر قرآن'' ہمارے ہم خیال ہے تیسری صورت میں ہمارا خیال پھر بالکل منفرد رہ جاتا ہے۔

قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اس تشریح پر غور فرمائیں اور اس ہیچ مدان کو اپنے غور و فکر سے مطلع فرمائیں۔ یہ ایک باہمی اجتماعی کوشش ہے اور اس میں اپنے غور و تفحص میں دوسروں کو شریک کرنا فائدہ مند ہوگا۔

ان اریـــد الا الا صـــلاح مـــا استطعت (۱۱/۸۸)۔

جہاں تک مجھ سے بن پڑے میں تو اصلاح کے علاوہ اور کچھ چاہتا ہی نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایس۔اے۔کیانی

''اساطیر الاولین''

(ماہنامہ طلوع اسلام کے ستمبر ۲۰۰۶ء کے شمارہ کے انگریزی سیکشن میں محترم جناب ابوبی رانا صاحب کا ایک فکر انگیز مضمون "Past Poking Phrases" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔اس مضمون کی افادیت اور اثر پذیری کی وجہ سے راقم نے اس کو ''**اساطیر الاولین**'' کے عنوان سے اردو زبان میں ڈھالنے کی جسارت کی ہے تا کہ اردو دان طبقہ بھی اس فکر انگیز مضمون سے استفادہ کر سکے۔)

ازمنۂ قدیم سے انسان کی' اپنی بقا کے لئے' یہ کوشش رہی ہے کہ وہ فطرت کے قوانین کو سمجھے۔ ہر نئے قانون کو دریافت کرنے سے اس کو زندگی میں چند آسانیاں میسر آتی گئیں۔لیکن یہ ان کے لئے ہوا جنہوں نے زندگی کے بارے میں سوچا۔

''ایک عظیم خیال صرف اس لئے وقوع پذیر نہیں ہوتا کہ وہ بہت سے لوگوں کا انتظار کرے کہ وہ آگے بڑھ کر اس کو عملی جامہ پہنائیں۔تاریخ کے بارے میں یہ ایک بچگانہ نقطۂ نظر ہے''۔ (اے۔این۔وائٹ ہیڈ)۔

انسانی تاریخ ہمیں ایک اور حقیقت سے بھی آگاہ کرتی ہے کہ انسانیت ایک طویل عرصہ میں آہستہ آہستہ فطرت کے قوانین اور قوتوں کو مسخر کرتی گئی۔فرق صرف یہ ہے کہ پرانے تاریک دور میں اگر کوئی انسان فطرت کے کسی قانون کو دریافت کرتا تو اس کو بڑا بلند مقام دیا جاتا اور خیال کیا جاتا کہ اس کے پاس کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جب انسان نے اپنے لئے ایک معاشرتی ڈھانچہ ترتیب دے لیا تو لوگوں نے ایسے انسانوں کو سزا دینا شروع کر دیا جو سچائی کے کسی حصہ کی کھوج لگاتے یا اسے دریافت کرتے۔مثلاً جب ارشمیدس ایک سچائی کی تہہ تک پہنچ گیا اور اس کو اچھال کے قانون (Law of Buoyancy) کی صورت میں

پیش کیا تو اس کو لوگوں نے اس جرم پر سزا سے ہمکنار کیا۔

اسی طرح گلیلیو کو اس بات پر سزائے موت سنا دی گئی کہ اس نے کہا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

''جب ایک حقیقی نابغہ اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے تو تم اس کو اس طرح پہچان سکتے ہو کہ تمام کم عقل لوگ اس کے خلاف ایکا کر لیں گے''۔ (سوئفٹ)

دنیا میں خراماں خراماں لیکن مستقل مزاجی سے جو بھی ترقی رو بہ عمل ہو رہی ہے اس کا سہرا اس بات کو جاتا ہے کہ ''توجیہ'' (Reason) بہیمانہ طاقت کو آہستہ آہستہ شکست دیتی جا رہی ہے۔

تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ کے اس تمام عرصہ میں لوگوں نے اپنے ذاتی خیالات' حالات و واقعات اور تجربات کی بنیاد پر محاورات اور اقوال گھڑے۔ (اسی بنیاد پر انگریزوں کی نوآبادیات برصغیر پاک و ہند بھی اس روش سے مبرا نہیں ہے) جیسے مثلاً یہ عام استعمال کے محاورات "Honesty is the best Policy"۔ "Might is Right" اور "Majority is Authority"۔ یہ وقتی اظہاریے نہ تو ہر آنے والے دور کے لئے ہو سکتے تھے اور نہ ہی ہونے چاہئیں تھے۔ یہ ظالم اور مظلوم ہر دو قسم کے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ ظالمانہ سماج کی مثال' اس جذب پذیریت کی سی ہے جو تمام خوش امیدی' خواہشات' روحانی طاقت اور سوچ کو چوس جاتی ہے۔ جو اس کے نزدیک سے بھی گزرتی ہے۔

"Honesty is the best Policy" کے پیچھے جو سوچ کارفرما ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ محاورہ کسی سیاسی ذہن کی پیداوار ہے۔ اس کے برعکس' آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ایک شریف النفس انسان اس بات کو اس طرح ادا کرے گا۔ "Honesty is the best Principle" جیسا کہ لوئس ایم۔ ہاروے نے ۱۹۵۳ء میں اپنے خطاب میں کہا تھا۔ وہ کہتا ہے۔

''یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ سیاست کو پیشہ کے طور پر بھی اختیار کریں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ ایماندار بھی رہیں''۔

اسی طرح ایک اور انتہائی ظالمانہ اظہار یہ ہے جسے دنیا میں بہت زیادہ قبولیت ملی اور جس کو کسی نے جھٹلانے یا تردید کرنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ ہے "Might is Right"۔ یہ ہیں تو صرف تین الفاظ لیکن یہ ہر کمزور انسان کو خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ آیئے ہم ان الفاظ کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں اور دیکھیں کہ آیا ان الفاظ کو تبدیل کرنے سے سوچ میں بھی تبدیلی آتی ہے یا نہیں۔ نئی ترتیب یہ ہو سکتی

ہے۔ "Right is Might" آپ سوچیں کیا یہ زیادہ موزوں محاورہ نہیں ہے؟ یہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہم تلاش کریں کہ سچ اور حق (Right) کیا ہے؟ یہ ایک بہت ہی اہم بات ہے۔

یہ اور اسی طرح کے دوسرے روایتی محاورے ہماری نوجوان نسل میں تشدد پسندی ور انتہا پسندی کو فروغ دیتے ہیں اور آخرکار ان کی مثبت ذہنی بڑھوتری کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ہر سوچنے والا بالغ نظر ذہن یہ مشاہدہ کر رہا ہے کہ کس طرح ہماری قوم کے ناپختہ ذہن' ہیرو بننے کے لئے "Might" یعنی طاقت کے حصول کی جدوجہد میں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان کے پاس یہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ہے کہ Right (حق) کیا ہے۔ کیوں کہ ان کو بچپن سے ہی یہ بتایا جاتا ہے کہ "Might is Right"۔ اس لئے وہ شروع ہی سے اس غلط راہ پر لگ جاتے ہیں کہ زندگی اسی شئے کا نام ہے۔ اس ناپختہ خیالات کے دور میں بچوں کے کمزور اذہان پر ایسے ہی نظریات کی بوچھاڑ مختلف ذرائع سے مسلسل کی جاتی ہے۔ یہ نظریات ان میں یہ بات راسخ کرتے جاتے ہیں کہ وہ ایک عظیم انسان بننے کے لئے طاقت حاصل کریں' طاقت ہر قیمت! پر دولت کی طاقت' شہرت کی طاقت' ننگی جارحیت کی طاقت۔ مزید یہ کہ گلیوں میں پروان چڑھنے والے بدقسمت بچے نخوت کی طاقت حاصل کرنے کے در پے رہتے ہیں تا کہ وہ عوامی ہجوم سے الگ تھلگ نظر آئیں۔

لوگ کہتے ہیں 'Justice delayed is justice denied' مجھے اس جملہ کی تصحیح کرنے دیں 'Justice denied is life denied' جب بچے زندگی کے حقیقی مسائل سے بے بہرہ ہو جائیں اور ان کو ان مسائل کے اوپر بے فکری سے سونے کا سبق دیا جاتا رہے تو ان میں اچھی خواہشات کی نمو اور ان خواہشات کی دوسروں تک تعمیری منتقلی نہ صرف موقوف ہو جاتی ہے بلکہ ان کی ذات میں بھی کجی رہ جاتی ہے۔ وہ اس طرح سے بڑے ہوتے ہیں کہ ان کے پاس دوسروں کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں سے اس لئے بھی میل جول نہیں رکھتے کہ اس سے ان کے خیالات کی عمارت میں دراڑیں پڑنے کا احتمال ہوسکتا ہے اور ان کے ہاں کسی بھی بات کو سوچنے پر پابندی ہوتی ہے۔ وہ زندگی اور اس کے خوش نما رنگ نہیں چاہتے بلکہ وہ مزید طاقت چاہتے ہیں تا کہ وہ اپنی انا کی تسکین کر سکیں۔

مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ان کو یہ بتانا گوارا نہیں کرتا کہ 'Might is Right'

صرف اس کے لئے ضروری ہے جو کُشتی کے کھیل کو اپنا پیشہ بناتا ہے۔

ہمارے ملک کا پڑھا لکھا طبقہ سرسید، علامہ اقبال اور قائداعظم کے ناموں اور کارناموں سے اچھی طرح واقف ہے۔ ان حضرات نے اپنی زندگی میں کتنی کُشتیاں لڑیں۔ جن سے ثابت کیا ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کسی حد تک سچے (Right) ہیں۔ بلکہ انہوں نے اپنی جدوجہد سے یہ بھی ثابت کیا کہ 'Majority is not Authority'۔ بقول ایمرسن ''ہر انقلاب ایک فرد واحد کی سوچ ہوتا ہے''۔ یعنی "Authority that rules the Majority'۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ متحدہ ہندوستان میں مسلم اکثریت (Majority) دن میں پانچ بار جھکتی تو اللہ کے حضور تھی مگر وہ حفاظت کرتی تھی ملکہ برطانیہ اور کانگریس کے مفادات کی۔ یہ لوگ اگر اکثریت میں بھی تھے اور اتھارٹی بھی تھے اور کانگرس کا بھی ساتھ دیتے تھے تو یہ لوگ ہندوستان میں ہی کیوں نہ رہ گئے تو صاحبو! یہ لوگ Majority تو تھے Authority نہیں تھے۔ Authority تو صرف ایک شخص کے پاس تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے برطانوی حکمرانوں کے زیرسایہ لنکنز۔ ان سے قانون کی ڈگری لی۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کے مشہور مورخ پروفیسر ایس والپرٹ انہی قائداعظم کے اوپر لکھی گئی کتاب میں رقم طراز ہیں۔

''تاریخ میں صرف چند افراد ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے تاریخ کا دھارا بدلا۔ ان سے بھی کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے دنیا کا نقشہ تبدیل کیا اور ایسا تو شاذ ہی کوئی ہوگا جس نے ایک قوم بنائی ہو۔ محمد علی جناح اکیلے نے یہ تینوں کام کئے''۔

میں اکثر حیران ہوتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی یہ زحمت گوارا کیوں نہیں کرتا کہ وہ لوگوں کو یہ بتائے کہ اس عظیم ہستی نے یہ تینوں مشن سرانجام دیئے، بغیر کسی غیرقانونی ہڑتال کے، بغیر کسی دہشت گردی کے اور بغیر کسی فوجی مداخلت کے تو جناب من 'Might is not right' بلکہ 'Might is blight' یعنی (اندھی) طاقت ایک بدنما داغ ہوتی ہے۔

ایک سابقہ امریکی صدر آئزن ہاور نے ۱۹۵۳ء میں اپنے خطاب میں ارشاد فرمایا۔

''ہر بندوق جو بنائی جاتی ہے۔ ہر بحری بیڑہ جو تیار کیا جاتا ہے اور ہر راکٹ جو داغا جاتا ہے۔ حقیقت میں ایک بھوکے سے چرائی ہوئی روٹی اور ایک ننگے کے جسم سے اتارے ہوئے کپڑے ہوتے ہیں۔ یہ دنیا ہتھیاروں پر صرف پیسہ ہی خرچ

نہیں کرتی۔ بلکہ یہ خرچ کرتی ہے محنت کشوں کا پسینہ' سائنسدانوں کی ذہانت اور بچوں کے سر کی چھت۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ جنگ کے سایوں میں یہ انسانیت ہے جو آہنی صلیب پر لٹک رہی ہے''۔

جاہل اور کم تعلیم یافتہ ہی ہمیشہ طاقت کے حصول کی طرف مائل ہوتے ہیں۔اور بقول وائٹ ہیڈ۔

''طاقت کا نشہ زندگی کی لطافتوں کے لئے زہرِ قاتل ہوتا ہے''۔

آخر میں' میں یہ عرض کروں گا کہ اس طاقت کے شیطان کو قابو کرنے یا ختم کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو یہ سکھانا پڑے گا کہ ہم کس طرح اپنے معاشرتی ڈھانچہ میں توازن پیدا کر سکتے ہیں اور یہ صرف اور صرف قرآن کریم کے سنہری اصولوں کو مدنظر رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوبکر رانا

سُن اے غافل صدا میری!

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی

یہ لیلیٰ مجنوں یا شیریں فرہاد کی کہانیاں تو نہیں کہ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ اس کا تعلق تو آتش نمرود اور حضرت ابراہیمؑ، فرعون اور حضرت موسیٰؑ کی جاں سوز اور حیرت انگیز رزمِ حق و باطل کے لمحات سے ہے۔

ہم سب اس دنیا میں آنکھیں بند کئے داخل ہوتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے رحلت کر جاتے ہیں۔ اس حقیقت سے ہمیں یہ مطلب نہیں اخذ کر لینا چاہئے کہ ہمیں اپنی زندگی بھی آنکھیں بند کر کے گزارنی ہوگی۔ آنکھیں بند کرنے سے تو ٹھوکریں ہی لگتی ہیں اور ان ٹھوکروں کو تو وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے اندر ہوش سے زندہ رہنے کی رمق باقی ہو۔ جو مدہوشی کے عالم میں اپنے دن بسر کر رہے ہوں ان کے لئے اندھیرا ہو یا روشنی دونوں ایک برابر ہیں۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے فارسی کلام میں ایک جگہ فرمایا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:

بت خانہ میں جاگتا ہوا کافر
حرم میں سوئے ہوئے مومن سے بہتر ہے

اپنے گردونواح کا بغور جائزہ لیجئے بظاہر خلوص، مروت، ہمدردی کی دل آویز صدائیں جو روز ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں تقریباً سب دنیاوی دکھاوا اور روایت پر مبنی ہوتی ہیں۔ ہر انسانی یا حیوانی ذہن کو قدرت نے اس کے اپنے جسم کے دفاع کے لئے بنایا ہے۔ کوئی ہوش مند اور تعلیم یافتہ انسان اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ انسانیت کے سمندر میں ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا رہی ہے۔ اس سمندر میں

سلطانی بھی عیاری درویشی بھی عیاری۔ (اقبال)

اس دور میں ہمارا معاشرہ ایسے سمندری جہاز میں سفر کر رہا

ہے جوطغیانیوں اورطوفان کی لپیٹ میں گھر چکا ہے۔ وہ جہاز جو طوفان کی گھمبیر گھٹاؤں میں دائیں بائیں سے طوفانی ہواؤں کے تھپیڑے کھا رہا ہو اس میں سفر کرنے والا مسافر سیدھا کھڑا کیسے رہ سکتا ہے۔ اندریں حالات ہر مسافر کو اپنی موت ہی دکھائی دے رہی ہو گی۔ ایسے موقع پر جہاز کے ساتھ جو چھوٹی چھوٹی جان بچانے والی کشتیاں لٹکی ہوتی ہیں ان کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ ان میں جن مسافروں کو بھر کر سمندر میں اتاریں گے وہ چھوٹی اور ہلکا ہونے کے باعث طوفان کی لپیٹ میں زیادہ جلدی پھنس جائیں گی۔ ایسے طوفان میں تو جہاز کے ساتھ آبدوز بیڑے لگانے چاہئیں جو سطح سمندر سے نیچے اورطغیانیوں کی زد سے مسافروں کو دور لے جا سکیں اور پھر اس کے بعد اپنے مرکز سے رابطہ قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ایک طرح سے یہی حکمتِ عملی حضور آخرالزماں ﷺ نے سرانجام دی۔ حقیقت کی تلاش میں جو مٹھی بھر نفوس حوصلہ اور ہمت ہار چکے تھے انہیں پہلے حوصلہ اور اُمید بخش کر توحید کے جھنڈے تلے جمع کیا اور اس کے بعد دولت و منصب اور ہوسِ اقتدار کی پاگل کر دینے والی طوفانی چمک دھمک سے نکال کر راتوں رات مدینہ کی طرف ہجرت کروا دی۔ اس انقلاب کا یہ پہلا اہم قدم تھا اور اسی واقعہ سے اسلامی کیلنڈر کی ابتداء ہوئی۔

Tensions اور پریشانیاں انسانوں کے بنائے ہوئے نظام میں اقتدار اور حکمرانی کے مقابلوں سے نمودار ہوتی ہیں۔ یعنی سرمایہ داری کا وہ نظام جس کا دارومدار زیادہ سے زیادہ زرجمع کرنا اور دیگر مادی اشیا اکٹھی کرنا ہوتا ہے۔ اس قسم کا حکومتی نظام غاصبانہ' جارحانہ اور بازی گری کے طریقے سکھاتا رہتا ہے جس سے لوگ ظالمانہ ذہنیت میں ڈھلتے رہتے ہیں اور اس کے اثرات چھوٹے چھوٹے خاندانی جھگڑوں سے شروع ہو کر سرمایہ دار ممالک کے درمیان جنگ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اہل کار اپنے اندر سے غیر مادی زندگی کے تصور کو مٹانا چاہتے ہیں۔ لاریب! یہ ناممکن ہے۔ ملوکیت کبھی بھی قرآن کی مستقل اقدار کو برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ مستقل اقدار اور اصولوں کا غیر مادی اشیاء میں شمار ہوتا ہے اور اس تعلق کو سرمایہ دار کی دنیا سمجھ نہیں سکتی۔ اہل ملوکیت کے لئے زر اور مستقل اقدار کے تعلق کا علاج ایک ہی ہوتا ہے۔

''وہ قرآن میں درج مستقل اقدار اور اصولوں کے نظام کو رسومات کی ملمع کاری دے کر مذہب کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور عوام کی اکثریت جو اصل قرآنی ذہنیت سے ناآشنا ہوتے

ہیں ان میں قرآن کی حقیقی لِم (Spirit) کو بیدار ہی نہیں ہونے دیتے! اور اس طرح ساری کی ساری قوم پریشانیوں کے جال میں پھنسی رہتی ہے''۔

ابوسفیان نے حضور رسالت مآب ﷺ کا تعاقب اسی لئے کروایا کہ کسی طریق سے ان کے ذہن سے اللہ کو (جس کی ذات کسی بشر کو نظر نہیں آتی) نکالا جائے۔ اللہ کا تصور عربوں کے لئے خطرے کا باعث تھا کہ عربی سرمایہ دار نے کعبہ کو بت خانہ بنایا ہوا تھا اور لوگوں کو رسومات میں الجھا کر ان کو آپس میں لڑواتے اور فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہی کچھ نمرود کیا کرتا تھا اور فرعونوں کے خاندان نے بھی لوگوں کو دنیاوی رسومات میں مست رکھا ہوا تھا۔ آج کا سرمایہ دار بھی یہی کچھ کرتا پھرتا ہے۔ ''اصلی قرآنی نظام سرمایہ اور علم کی حکمتِ عملی کے قوانین سے توازن پیدا کر کے آدمی کو انسان اور پھر مسلمان کے درجہ پر پہنچا دیتا ہے''۔ قرآنی نظام میں بات کو دوسروں پر ٹھونسا نہیں جاتا (Not Thrust) بلکہ یہ نظام ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جس کا ہر فرد ایک دوسرے پر بھروسہ (Trust) کر کے بات کی تہ تک پہنچے بغیر کوئی فیصلہ کن بیان نہیں دیتا۔ (قرآن ۳۶/۱۷، ۴۳/۲۵) قرآنی نظام ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں لغزش کے امکانات کم سے کم ہوتے جائیں۔

میری علماء کرام سے عرض ہے کہ قیامت تک آپ اپنی نماز کے وقت مساجد میں صفیں سیدھی کرتے جائیے۔ جب تک آپ حضرات قرآنی قوانین کو سیدھی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے معاشرہ میں بدمزگی اور فرقہ وارانہ فسادات اور بڑھتے چلے جائیں گے۔ شیطانی قوتیں ٹیڑھے قوانین کی وجہ سے اسلام میں داخل ہوتی ہیں اور سارے قرآنی نظام کی جدوجہد درہم برہم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارے مولویان حضرات کے وضع کردہ ٹیڑھے قوانین ہیں جس کی بنا پر انتشار پیدا کرنا شیطانی قوتوں کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام کا زوال مسلمانوں کی لاپروائی کی وجہ سے مشرکین اور منافقین کے سبب ہوا۔ مشرکین غول در غول قرآنی سلطنتوں میں داخل ہو کر Virus کی طرح اپنے من گھڑت اور غلط نظریات کو پھیلاتے رہے اور آخر کامیاب ہو گئے!

کافر تو مسلمان کی طرح دوٹوک اور صاف بات کرتا ہے۔ وہ تو ببانگِ دہل کہتا ہے کہ مجھے تمہارے اللہ پر ایمان نہیں۔ کافر مقابلہ کرتا ہے۔ وہ منافق کی طرح عقیدے کو گول مول نہیں رکھتا یا کسی بات میں ابہام نہیں رکھتا۔ کافر تعاون اس لئے نہیں کرتا کہ اللہ پر ایمان لانے

سے اس کی عیش و آرام کی زندگی ختم ہو جاتی ہے جس کو وہ برداشت نہیں کرسکتا۔ اسی وجہ سے وہ ساری زندگی ہر ایک سے مقابلہ اور لڑائی کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی نظام ہر لمحہ امن وسکون کی خاطر دوسروں سے معاہدہ کے مواقع تلاش کرتا ہے اس بنا پر کہ دوسرا بھی اپنے قول واقرار پر پابند رہے گا۔

مقابلہ خواہ کھیلوں کے میدان میں ہو یا جنگ کے روپ میں اس میں مبالغہ نہیں کہ مقابلے میں ہر فریق اپنے مدمقابل کو نیچا گرانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ تہذیب نے اسے سکھایا ہی یہ ہے کہ عزت دوسرے کی زندگی بچانے سے نہیں بنا کرتی بلکہ فریقِ مقابل کو کچل کر اور ہو سکے تو اسے مار کر ہی عزت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے تمام نظاموں کی عمارت دوسروں کے خون کو بہا کر تعمیر ہوئی ہے۔ جب فریقین مقابلے پر اتر آئیں تو اس صورت میں خلوص اور ہمدردی کا کیا عمل دخل۔ ''خلوص اور ہمدردی تو اس وقت پیدا ہوگی جب کسی قوم یا ملک کا نصب العین اور جذبہ انسانیت کے لئے ہوگا''۔ ورنہ سیاسی جنگ ہو، مذہبی یا کاروباری میدان۔ ہر فرد رام رام کی مالا جپتا ہے اور بغل میں چھری چھپائے پھرتا ہے۔ طبقات کی جنگ قوم یا ملک کا جذبہ ختم کر دیا کرتی ہے۔ برطانوی طرز حکومت میں پھر بھی کچھ اصول تھے اور ان عہد و پیماں کے وہ خود بھی پابند رہتے تھے لیکن ہندو مسلمانوں کو برطانوی حکمرانوں کے قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا جس کی وجہ سے مسلمان ذلیل وخوار ہو رہے تھے۔

شاید یہی انسانوں کے ہاتھوں انسان کی تذلیل تھی کہ اللہ کی رحمت نے سر اٹھایا اور مسلمانوں کو سرسید احمدؒ ڈاکٹر علامہ اقبالؒ قائداعظمؒ اور اس کے بعد علامہ پرویزؒ (جنہیں مفکر قرآن کے لقب سے پکارا گیا) جیسے دور اندیش لیڈروں سے نواز دیا۔ وگرنہ آج کے دور کے رجحانات سے لگتا ہے کہ یہ قوم آزادی کی مستحق نہ تھی۔ ایسی سچی، بے غرض اور مخلص ہستیاں آج کے پاکستان میں کتنی نظر آ رہی ہیں؟ قائداعظمؒ نے اپنی اولاد، گھر، دن کا چین اور رات کی نیند قربان کر دی، اسلامی مملکت کی خاطر، پھر نواب زادہ لیاقت علی خان نے بھی یہی کچھ اپنی جائیداد کے ساتھ کیا اور اس کے بعد گولی کا نشانہ بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد علامہ پرویزؒ ایک کالج بنانے کی لگن، امید اور آرزو میں چندہ اکٹھا کرتے رہے۔ اس مہم میں انہوں نے ہزاروں روپیہ اکٹھا کر لیا۔ آخر میں جب جاگیرداروں اور قبضہ گروپ کے ہاتھوں نالاں ہو گئے تو سارے کا سارا جمع کیا ہوا روپیہ جن سے لیا تھا اپنی زندگی ہی میں واپس لوٹا دیا۔ اس سے اندازہ

ہو جانا چاہئے کہ ہمارا جاگیردارانہ حلقہ کتنی قدر و منزلت دیتا ہے تعلیم کو.....اسی لئے تو آج مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں سے بیزار ہے۔ ؎

تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں!

سچے' بےغرض' بےلوث لیڈر تو ہمیں سبق پڑھا گئے کہ قوم کی زندگی سچائی اور ایمانداری سے بنتی ہے! بڑھتی پھلتی اور پھولتی ہے' علم کے سمندر میں ڈوبنے سے! دولت' شہرت' منصب و اقتدار انسان اسی دنیا میں چھوڑ کر رحلت کرتا ہے۔ ذہن میں ہم یہ سوچ رہے ہوں کہ ''چمڑی جائے دمڑی نہ جائے'' اور منہ سے اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے کے خواہشمند ہوں۔ یہ ہے اصل المیہ جو ہمارے قول و فعل میں تضاد کا ذمہ دار ہے اور جس وجہ سے آج ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

اگر ہم منافق نہیں اور اللہ پر ایمان ہے تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ موت کے بعد کوئی نہیں پوچھے گا کہ تمہاری کنیت دنیا میں کیا تھی؟ تم کس صوبہ کے چیف منسٹر تھے یا کون سے ملک کے سربراہ' ڈاکٹر' پروفیسر یا انجینئر؟ کسی اسلامی جماعت کے صدر؟ کلرک تھے یا چپڑاسی؟ پوچھا اگر جائے گا تو یہ کہ تمہارا حسنِ سلوک' تمہارا قول و فعل' تمہارا لین دین' تمہارے عہد و پیماں کہاں تک سچائی پر مبنی تھے؟ ازل سے دنیا کا کاروبار چلتا آ رہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا لیکن دنیا کو گلشن بنانے کا کاروبار لوگوں سے نہیں ''نفس جبرئیل'' (قرآنی رہنمائی) سے چلتا ہے۔

As-Salaat (Gist)

What Quran Says?

By

G.A.Parwez

English Rendering: Shahid Chaudhry

Edited by: Khalid. M. Sayyed, Peterborough, UK

==========

Salaat is one of the fundamental principles of Islam. In the Qur'an the word *Salaat* and its numerous forms, derived from verbal roots **Sa'd lam waw** and **Sa'd, lam ya,** have been profusely used. *Al-musalli* is horse, which occupies the second spot in a race but runs so close that its ears brush the rear portion of the winning horse-(the one in front). The basic meaning of this root is to follow a leader closely and constantly in every walk of life. So *Salaat* means:

- To remain attached to the Laws of Allah, to remain within the parameters of the Laws of Allah and to remain devoted to the Book of Allah. As such, *tasleah* means to walk behind a person without overtaking him, but so closely that there remains hardly any gap between the two, and also to follow him by remaining devoted to him. On the basis of this, Raghib says, "The verse of the Qur'an *lam naku minal-Musalliin* (74:43) - we were not *Musalliin* -means that we were not the followers of the *Ambia* (Messengers)."

- To tread a balanced and straight path. This happens to be a du'a (entreaty), the Qur'an teaches us in its very first Surah (Al-Fatiha). A Muslim always desires to be on the straight and balanced path because he has to uncompromisingly follow Allah, Who continuously stays on a straight and balanced path – *Sir'at-al-Mustaqeem*(11:56). To follow Allah is to adhere willingly to His laws as enshrined in the Qur'an and to imbibe in one's personality Allah's most balanced attributes (called *Asmaul Husna*), of course, as closely as humanly possible.

- The method to carry out the duties. In *Surah Noor* (24:41) Allah poses a question: "Have you not pondered over the fact that whatever is there in the universe, including the birds with wings outspread, is continuously accomplishing its assignments with utmost sincerity because it is well aware of its duties (*tasbih)* and the method (*Salaat)* to carry them out." This obviously means that by instinctive drive *everything and every being in the universe knows as to what its tasbih and Salaat are*; the course it has to take and where it is destined for, and the cycle of struggle it has to undergo. This is called its *tasbih* and *Salaat* (For *tasbih see siin ba ha* – Lughat- ul-Quran vol. 2, p. 834). But Man has not been endowed with this instinctive know-how. He has been told of his duties and methods through *wahi* (revelation). As far as man's physical needs are concerned, he can gain knowledge about them through thought, consciousness, deliberation, intellect, experience and observation. But for the development of his personality and his needs of 'humanity' he has to rely on *wahi.* As such, for a man to know as to what his *tasbih* and *Salaat* are he has to know and to have faith in *wahi.* And in order to fulfil this objective it becomes essential to act as per the programme of *wahi.* This is, according to Quran, *iqamat-e- Salaat*- establishing the system of *Salaat.* To follow the Laws of the Quran is *wa yuqiimuunas-Salaat* (2:3). *Surah Alaq* (96:9-10) says, "When an obedient follower of Allah tries to discharge his obligatory duties then he (his enemy) puts obstacles in his way." The scope of these obligatory duties is quite wide and they encompass all aspects of life. In *Surah Hud* (11:87) it is stated: " The people of Shu'aib asked him: 'Does your *Salaat* command you that we should forsake that which our fathers (used to) worship, or that we (should leave off) doing what we like with our own property?''' In other words they did not fully comprehend the structure of *Salaat* which encompasses even economic matters.

- To establish a system in accordance with the Laws of the Quran. It is not possible for a person to individually act per the programme of the *wahi (iqamat-e-Salaat).* This can only be done collectively within a system. .That explains the Quran's use of plurals in this context. Hence, it is the responsibility of an Islamic state to establish this order. The Quran says: "They are the ones who, when given power in the land, establish (the system of) *Salaat* and *Zakat* (see ***zay kaf waw*** Lugat-ul- Quran vol. 2 p 808-811). And they enjoin the right and

forbid the wrong." (22:41). Also (9:12) Elsewhere the people engaged in establishing the Divine Order are defined as people who do *Rukoo* (bow down) and *Sajda* (prostrate or fully surrender before the Laws of Allah). (For *rukoo* see *ra kaf ayn* and for s*ajda* see ***siin jiim*** **daal***,* Lugat-ul-Quran p. 778 and 844-851). It is for this reason that at another place (42:38) *iqamat-e-Salaat* and mutual consultation for the State's political affairs are discussed together: "They establish *Salaat* and (then) resolve their affairs through mutual consultation." And since all the affairs of the Muslim community are resolved in the light of the Laws of Allah (Book of Allah) therefore in *Sura Araaf* (7:170) *yummassikuu-na bil Kitaabi* and *aqaa-mus-Salaah* are placed together. As such, *iqamat-e- Salaat* means to establish a system in which all participating persons are consistent in following the laws of the Quran, and in this way remain in harmony with the Quran. In order to highlight this objective the Quran has used the word *tawallaa* as an antonym of *sallaa* (75:31-32). *Tawallaa* means to deny and flout the correct path, to find ways of digression, to turn back, to refuse to acknowledge. Therefore, *sullaa* would mean to keep moving on the correct path in accordance with the Divine Laws, and to fulfil the duties determined or fixed by the Divine System. It is on this basis that Allama Hamiduddin Farahi in his '*Mufrad-tul- Quran'* says that one of the meanings of *Salaat* is to turn towards someone, to look up to him, to be attentive, and to turn one's face (towards someone) in attention.

- <u>To surrender completely before the Laws of Allah and not to follow one's own desires.</u> This meaning has been beautifully elucidated in *Surah Maryam* (19:59) where *iqamat-e-Salaat* and following one's own vain desires have been placed as antonym of one another, "Such unworthy generations succeeded (the Messengers) that they ruined the system *Salaat)* and followed their own emotions and desires." It means that to follow one's own desire is to distort *Salaat* and to follow the laws of Allah is to establish and keep intact *Salaat.* In *Surah Anam* (6:93) it is stated that the guardians of Salaat (system) are no different from those who have *Eiman* (conviction) in the Hereafter and the Book of Allah. Ibn-e-Qutaiba (Al-Qurtain vol.1, p.13) says that indeed *Salaat* means *ad-Diin* and *iqaamat-e-salaat* means *iqamat-ud-Diin*.(economic and socio-political system) Moheet and Aqrab-ul-Mwadir).

- To overcome one's defects and shortcomings. The author of 'Al-Minar' asserts that *Salaat* is recognition of the fact, both verbally and practically, that in order to eradicate one's imperfection one needs the Guidance of the Superior Authority, who is Perfect and without any deficiency. Owing to this Qurtabi says that *Salaat,* in fact, means to obediently follow Allah.

- To tame, to subjugate, and to arrest someone's attention. In this reference the exposition of *Salaat* would be to subdue and tame the forces of the Universe and make them obedient to Man. (Moheet-ul-Moheet).

- Reverence and admiration. In other words *As-Salaat* means to demonstrate the Greatness of the Sustainer of this Universe with your realistic programmes, like establishing a socio-economic system. This shows that *iqamat-e-Salaat* and *itaa-e-Zakat* are correlated, i.e. to chalk out a programme in accordance with the Divine Laws, follow it practically and sincerely so as to give every person a chance to develop his personality and also provide means of nourishment.

- To offer *Namaz*. The varying meanings of *Salaat* mentioned above clearly suggest that when an obedient Muslim follows the Laws of Allah in any sphere of life to discharge his obligatory duties he, in fact, is performing *Salaat* only. And for this no time, place or form is necessary. But in the Quran at certain places the word *Salaat* has been used for a particular act or ritual, commonly called *Namaz* (A Pehalvi language word not used in the Quran). For instance: verse 5:6 outlines the method of ablution, which is to be performed when you rise up for *Salaat.* Verse 4:43 prohibits a Muslim from attending a *Salaat* congregation when in a state of *Sukr* (inebriation or drowsiness). And neither recite your *Salaat* aloud nor recite it in an inaudible tone, but seek a middle course (17:110). So the purpose of *Salaat* is served only when one understands what one is saying. However, it should be noted that for a Muslim the use of all types of intoxicants is prohibited (5:90-91) According to verse $;101 0ne can curtail *Salaat* if one fears an enemy attack. Verse 4:102 gives the method of shortening of *Salaat*. And *Surah Juma-ah* (62:9-10) says, **"**When the call is proclaimed for *Salaat* on Friday (or at the time of congregation), hasten earnestly to the *Zikr* of Allah, and leave off business (and traffic): that is better for

you if you did but know. And when *Salaat* is over, you may disperse through the land and seek of bounty of Allah: and involve yourself in '*Zikr* of Allah' frequently so that you may be successful.**"**

- At this juncture a significant point needs a short explanation. The superstitious instincts of Man concocted stories of the auspicious and the ominous. Similarly, for doing, and also for not doing, specific work he outlined certain hours of day and night with the belief that they were auspicious. The Quran, while eradicating other superstitions about time, also clarified that there is nothing auspicious or ominous about day and night and hours. As such, in Islam the very idea that things should be started at an auspicious hour is irrelevant. So even for *Salaat* the Quran says; "You can establish *Salaat* from early morning till late night" (17:78) This means that in order to establish *ad-Diin* (economic and socio-political system) the efforts of Muslims are not limited to any specific time or place. For example see *Surah* 3:190, 20:130, 50:39, etc. The whole life of a Muslim—his days and nights, his mornings and evening—is devoted in implementing the Laws of Allah. But in these efforts *Salaat* congregations also play a significant and essential role. The Quran calls them *kitaabam-mawquutaa* (4:103). One meaning of these words is: a specially prescribed duty. Another interpretation is a duty that has to be perfected on time. Thus the importance of adherence to time in congregation is obvious. The Quran specially mentions *Salaat-ul-Ishaa*. From this it is evident that during Rasoolallah's (messenger) days at least these hours were fixed for the *Salaat* congregations.

- <u>To become subservient to Allah.</u> This is an expanded interpretation of the word *ibadat* which is commonly but wrongly translated in English as worship. A close reading of the Quran unambiguously makes it clear that *'ibadat* of Allah' is not worship or *Pooja* as the followers of different religions perform. According to the Quran *'ibadat'* (see ***ain bad dal,*** page 1120 vol 3, Lughat-ul-Quran) means to follow the laws of Allah, or to become subservient to Him.' Obviously this subservience has to be accepted willingly at every step in life and in every department of worldly affairs. Its practical form is a system of State, which is established in accordance with the Quranic values. About the supporters of this system the Quran says: "They are the ones who respond to their Sustainer, and establish (the Quranic system)

> *Salaat*, who (conduct) their affairs by mutual consultations; who keep open (for the welfare of the humanity) that We (Allah) bestow on them for sustenance." (42:38). In these verses the point to be noted is correlation between obedience to Allah, establishment of a system (*iqamat-e-Salaat*) and conducting affairs of the State by mutual consultations. Obviously, in order to implement the laws of Allah mutual consultations are necessary to arrive at workable decisions on essential affairs. Thus for consultations assemblies become imperative. If seen in a broad spectrum these assemblies would be part of an establishment and sustaining a system, (*iqamat-e-Salat*). But in these assemblies one more fact has also been taken into consideration – man's nature of expressing his feelings through his limbs and other parts of the body (see ***ra kaf ain*** and ***siin jiim daal***. Lughaat-ul-Quran page 778 and 844). In reverence one bows one's head involuntarily. In submission 'the head surrenders'. Although, the Quran keeps in view the spirit behind action and facts, and does not give weight to mere formalism, but when form is required to represent an emotion or reality, it does not prohibit formalism, provided the form is not considered an end in itself. In the context of *Salaat* or (*Namaz*) the practical aspects of *sajda* and *qiyam* etc, that have come before us are for this objective. It is essential that when these emotions are practically expressed in collective form they should be in rhythmic harmony, otherwise there would be a total chaos in the congregation. To maintain discipline, harmony and unity in expressing intense respect, veneration, submission and compliance is in itself a big exercise for the development of the human personality.

The above discussion makes it amply clear that in the Quran *aqeemu-as- Salaat* has been used both for *Salaat* or *Namaz* congregations and for *aqamat-e-Diin* (the establishment and stability of the whole system in accordance with the laws of Allah, willingly following the Laws and orders of Allah and accomplishing those obligatory duties, which an obedient *momin* is expected to perform). To find out this distinction one has to consider the whole verse and the context in which it is revealed to see what exactly is meant by *aqamat-e-Salaat*. Similarly, one has to see in what context the word *musalleen* has been used, for it has been used for *jamat-e-momineen* (as a whole) or for those participating in the *Salaat* congregation. The Quran also tells about those *musalleen* who are at the pinnacle of human excellence (70:22-35) and about those for whom there is perdition (107:4-7)

- To respect, to bless, to encourage, to develop, to nourish, not to let decay or chaos to crop up. These are meanings that Raghib has given of *Salle alaihe*. By keeping them in mind one can easily understand the verses of the Quran in which this root occurs with 'ala. For instance, " Allah and His *malaaika* (*forces of nature)* encourage you; provide you with necessary means of growth, development and nourishment, and make your efforts bear fruits." (33:43). This verse is about those *momineen* who when faced with difficulties in the enforcement and establishment of *Diin* do not waver or get disheartened, but instead remain steadfast and bravely fight against all odds. Therefore, they become entitled to all the plaudits and encouragement from Allah (2:157) And with especial reference to Rasool-allah(PBUH) the Quran says: "Allah and all the forces of nature help and encourage the Rasool in the fulfilment of his programme. O *jamaat-ul-Momineen*: You should also help your Rasool in making his programme a success. Support him so that his efforts bear fruits.(33:56). And the practical method to help him is to submit before him and follow him (48:9)". Momineen are, (7:157) it is said at another place: "Those who corroborate and respect him, and help him (in such a manner that) they follow the Light (Quran) which is sent down with him (7:157)." So this is the method by which a *Momin* fulfills his duty of *Salaat alaihe*.

This, then, is the *Salaat* of Allah and His *Malaaika* on *jamat-ul-Momineen* and on Rasool-allah. And this is *Salaat* and Salaam of *jamaat-ul-Momineen* on Rasool-allah. Notice that the order of *salluu alayhi wa sal-limuu tasliimaa* (33:56) demands a great action-orientated programme. This means that by following the laws of Allah the *Diin* brought by Rasool-allah will prevail over all religions and philosophies of the world. On the other hand, it was said to the Rasool that when the members of *jamaat-e-Momineen* bring their earnings to donate in the way of Allah, he should accept them. And encourage them because encouragement and appreciation from you (Rasool) is an assuagement for them (9:103). They think that spending their earnings in the way of Allah is a means to be near to Allah and getting encouragement and appreciation from Rasool (9:99). (For the meaning of *Qurb-e-Allah* or to be near to Allah see the heading ***Qaf ra ba****)*.

- Jewish temples. According to the Hebrew dictionary *Salawat* (plural of *Salaat*) is synagogue or praying place of Jews. In verse 22: 40 this word has been used in this context or meaning.

END

==========